Multilingual & Multidisciplinary peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN - 2454-4036

انوار تحقیق

volume: Fifth
July-December 2018

شمارة:12-7
القیمة:50روپیہ

Editor
سید الیاس احمد مدنی

Address
9-10-380, -Neem Bowli Masjid Machora House, golconda Fort Hyderabad,
Telangana 500008

Multilingual & Multidisciplinary peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:- 2454-4035

ANWAR-E-TAHQEEQ

volume: Fifth
July-December 2018

Issue: 7-12
Price: Rs. 50/-

Editor
Syed Iliyas Ahmad Madni

Address
9-10-380, -Neem Bowli Masjid Machora House, golconda Fort Hyderabad, Telangana 500008

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۴ شمارہ۔۷ تا ۱۲ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰ روپئے سالانہ:۔۵۰۰ روپئے

نگراں:۔ **پروفیسر عزیز بانو**، صدر شعبہ فارسی، مانو، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔ **سید الیاس احمد مدنی**

زرتعاون کا ذریعہ:

Mr. Mubarak Hussain

Accnt no.: 50045054076

IFSC CODE: ALLA-0210134

Allahabad Bank, AMU, Aligarh

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔500 008

موبایل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان۔صدر شعبہ فارسی، بمبئی یونیورسٹی، ممبئی

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری لکھنؤ

ارمان احمد

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن

متین علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

عباس حیدر نقوی، ریسرچ اسکالر، اے ایم یو علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید۔صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

پی انوارادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

احمد علی، کیپر مینسکرپٹ۔سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔ ضیاءِتصوف			۳
۲۔ ریاست جھالاواڑ میں اردو شاعری کا آغاز وارتقا: تاریخی پس منظر	(اردو)	ڈاکٹرارشدسراج	۴
۳۔ حقنہ: معالجۂ فاضلہ ایک بہترین تاریخی فراموش شدہ طریقہ علاج	(اردو)	ڈاکٹرمحمداکمل ڈاکٹرشائینی ذوالفقار	۹
۴۔ خواتین اور اردو فکشن	(اردو)	ڈاکٹرای اے حیدری	۱۹
۵۔ سرسید کا نظریہ تعلیم	(اردو)	ڈاکٹرمعین الدین شاہین	۲۷
۶۔ سیف وقلم ٹونک	(اردو)	صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خاں	۳۲
۷۔ سروج سرونج کے گل سرسبد ناطق سرمد	(اردو)	صاحبزادہ ڈاکٹرشوکت علی خاں	۳۶
۸۔ معاصر اردو شاعری کی ایک منفرد آواز ملکہ نسیم	(اردو)	ڈاکٹرثروت النساء خان	۴۶
۹۔ اخلاق جہانگیری	(اردو)	ڈاکٹرمحمود فیاض	۵۴

ضیاءِ تصوف

ہم کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنی بداعمالیوں سے توبہ کر کے اپنے خالق و مالک کے سامنے ہی اپنا استغاثہ پیش کریں اور اسی سے عاجزانہ فریاد کریں کہ اسے شداد ونمرود اور فرعون کے غرور کو خاک میں ملادینے والے اور ان کی موت کو دنیا کے لئے سامانِ عبرت بنانے والے، ہماری نافرمانیوں سے درگذر فرما، ہماری دادرسی کر اور ہمارے زمانے اور ہمارے سامنے کے فرعونوں کا بھی وہی انجام کر جو تو نے شداد ونمرود اور حضرت موسیٰ کے ہم عصر فرعون کا کیا تھا اور ہماری بھی اسی طرح مدد فرما جس طرح تو نے پیٹ پر پتھر باندھ کر جہاد کرنے والوں کی مدد فرمائی تھی۔

(۱) مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق عمدہ ہیں۔

(۲) عمدہ اخلاق گناہوں کو اس طرح پگھلا دیتے ہیں جس طرح پانی برف کو پگھلا دیتا ہے اور برے اخلاق انسان کے اعمال کو اس طرح بگاڑ دیتے ہیں جس طرح سرکہ شہد کو بگاڑ دیتا ہے۔

(۳) عمدہ اخلاق گناہوں کو اس طرح پگھلا دیتے ہیں جس طرح سورج کی دھوپ یخ کو پگھلا دیتی ہے۔

(۴) خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ عزیز وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہیں۔ ہر آدمی اپنے عمدہ اخلاق سے اس آدمی کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے جو رات بھر عبادت کرتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔

(۵) میزان میں جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی وہ حسن اخلاق ہے، اور جس میں حسن اخلاق ہوں اس کا درجہ روزہ داروں اور نماز پڑھنے والوں کے برابر ہے۔

(۶) نیکی حسن اخلاق ہے اور گناہ وہ چیز ہے جو تمھارے دل میں کھٹکے اور تم اس بات کو گوارا نہ کرو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔

(۷) اے مسلمانو تم میں سب سے اچھے وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں اور جو تواضع اور فروتنی میں جھکے جاتے ہوں، اور تم میں سب سے برے وہ لوگ ہیں جو بدزبان اور بدگو اور دریدہ دہن ہیں

(۸) ایمان لانے کے بعد دانائی کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ آپس میں دوستی اور محبت رکھیں

(۹) اے مسلمانو! قیامت کے دن تم میں سے وہ شخص مجھ سے زیادہ قریب ہوگا جس کے اخلاق اچھے ہوں

(۱۰) مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق پاکیزہ ہیں اور فروتنی وتواضع سے جھکے رہتے ہیں اور جو لوگوں سے ملتے ہیں اور لوگ ان سے ملتے ہیں، جو لوگوں سے نہیں ملتے اور لوگ ان سے نہیں ملتے ان میں کوئی بھلائی نہیں۔

(از روح الاسلام معرف بہ احادیث منتخبہ)

ریاست جھالا واڑ میں اردو شاعری کا آغاز وارتقا: تاریخی پس منظر
۱۸۹۹ء سے موجودہ دور تک

ڈاکٹر ارشد سراج
صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ایس کے کالج سیکر

جھالا واڑ راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے ۱۸۹۸ء میں جب اس کے چوتھے حکمراں راج رانا بھوانی سنگھ والیٔ ریاست جھالا واڑ مقرر ہوئے تو اردو زبان وادب کے ارتقاء کے ایسے مدارج طے کئے کہ جن کی نظیر ریاست نہ اس سے قبل پیش کر سکی اور نہ بعد میں، اگر چہ والیٔ مذکور سے قبل ریاست ہٰذا میں راج رانا مدن سنگھ دوم، راج رانا پرتھوی سنگھ دوم اور راج رانا ظالم سنگھ دوم کے عہد میں اردو رائج ہو چکی تھی لیکن اسے ادبی حیثیت خاص طور راج رانا بھوانی سنگھ کے عہد حکومت میں حاصل ہوئی اس لئے بجا طور پر اس دور کو اردو شعر وادب کی ترقی کا عہد زریں قرار دیا جاتا ہے بالخصوص یہاں شاعری کا آغاز عبدالوحید نیرنگ کاکوروی کی آمد کے بعد ہوا۔ نیرنگ کاکوروی رشتہ میں حضرت محسن کاکوروی کے بھانجے تھے اور انہی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا تحصیل علم کے بعد نیرنگ کاکوروی ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے جے پور اور گوالیار پہونچے چند روز یہاں قیام کرنے کے بعد پنڈت پرمانند چترویدی دیوان ریاست جھالا واڑ کی فرمائش پر جھالا واڑ تشریف لائے چنانچہ یہاں ان کی علمیت اور قابلیت کے پیش نظر دیوان ریاست نے یکم جنوری ۱۸۹۷ء کو انہیں ملازم دربار کر لیا اور اس طرح نیرنگ کاکوروی نے تا وقت آخر یہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ والیٔ مذکور راج رانا بھوانی سنگھ کی فرمائش پر افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی تلمیذ داغ اور عالم گیر خان کیف ٹونکی بھی یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ ان شاعروں کی آمد کے بعد مشاعروں کا انعقاد کیا جانے لگا جو شعر وادب کے ارتقاء کے لئے بڑے ہی کارآمد ثابت ہوئے۔ جس طرح دہلی میں ذوق وغالب لکھنو میں آتش وناسخ اور انیس ودبیر کی شاعرانہ چشمکوں نے ایک خاص قسم کی ادبی فضا کو پروان چڑھایا اسی طرح ریاست جھالا واڑ میں بھی مولوی نیرنگ کاکوروی، آغا شاعر قزلباش اور کیف ٹونکی معاصرانہ نوک جھونک نے ایک مخصوص اور دلچسپ ادبی ماحول پیدا کیا جس کے سبب دیگر اہل ادب بھی جھالا واڑ کی طرف متوجہ ہوئے بقول مفتوں کوٹوی ریاست جھالا واڑ کا پہلا طرحی مشاعرہ راج رانا بھوانی سنگھ کی سالگرہ کے موقع پر ٹھاکر امراؤ سنگھ کے توسط سے والیٔ مذکور کے دربار میں منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں بھوانی سنگھ نے اس قدر دلچسپی لی کہ پھر یہ سلسلہ مستقل طور پر قائم ہو گیا اور اس موقع پر ہر سال بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہونے لگا اس طرح آئندہ بڑے مشاعروں کے لئے راہ ہموار ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں ایک پندرہ روزہ بزم مشاعرہ کا قیام عمل میں آیا مقامی طور پر شعر وادب کے ماحول اور اس کی فضا میں ایک نئی تازگی پیدا ہوئی۔ ان مشاعروں میں خود بھوانی سنگھ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اساتذہ اپنے تلامذہ کے گروہ کے ساتھ شریک ہوتے اور اپنے قلم کا جادو جگا کر داد وستائش حاصل کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مذاق شعر گوئی عام ہوتا گیا اور گھر گھر شعر وسخن کی شمعیں روشن ہونے لگیں۔ شعری نشستوں کا رواج پڑا اور شعراء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ بعد بھوانی سنگھ کی ترغیب پر ۱۹۱۵ء میں ایک اور ادبی تنظیم 'بزم سخن' کے نام سے قائم کی گئی۔ باقاعدہ طور پر اس کے اراکین وممبران کا انتخاب بھی کیا گیا۔ صدر کے عہدے پر صاحبزادہ فیاض علی فیاض اور سکریٹری کے عہدے پر سید مصطفیٰ حسین رضوی کو مقرر کیا گیا۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام بھی جھالا واڑ میں طرحی مشاعروں کا انعقاد کیا جانے لگا۔ مشاعرے کی اطلاع کے لئے باقاعدہ چھپے ہوئے دعوت نامے شاعروں کو ارسال کئے جاتے تھے ان میں تاریخ مشاعرہ، مصرعۂ طرح اور مقام مشاعرہ تمام تفصیلات درج کی جاتی تھیں۔ بزم سخن کے تحت منعقد ہونے والے مشاعروں کے تین ماہ کا کلام یہاں سے جاری ہونے والا رسالہ 'شاعری کی کایا پلٹ' میں شائع کیا جاتا تھا بزم سخن کے تحت ہونے والے مشاعرے بھوانی سنگھ کی ہدایت کے مطابق اصلاحی ہوا کرتے تھے مثلاً شائق کے دو شعر اس ضمن میں پیش ہیں

وہ لکھو جو شاعری ہو کام کی
چھوڑ دو باتیں گل و گلفام کی
وقت ضائع کر چکے آغاز میں
اب تو کچھ سوچو ذرا انجام کی

مولوی نیرنگ کاکوروی جھالاواڑ کی اس ادبی فضا پر چھائے رہے بلکہ یہ کہا جائے کہ جھالاواڑ میں موصوف کی آمد ہی شاعری کے ارتقاء کا موجب بنی تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ حضرت نیرنگ کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ علم عروض پر موصوف کی بڑی گہری نظر تھی نتیجۃ ان کے تلامذہ کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ جھالاواڑ کے کم وبیش تمام شعراء انہی کے حلقۂ تلمذ سے وابستہ رہے یہاں تک کہ راج رانا بھوانی سنگھ کے فرزندار جمند و جانشین راج رانا راجندر سنگھ بھی جو شاعری میں مخمور تخلص کرتے تھے نیرنگ کاکوروی کے شاگرد تھے۔ والیٔ جھالاواڑ بھوانی سنگھ خود بھی موصوف کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ یکم جنوری کو جب نیرنگ کی پنشن ہوئی تو والیٔ مذکور کی قدر دانی میں اور اضافہ ہوگیا اور ۲؍دسمبر ۱۹۲۷ء کی تقریب سال گرہ کے موقع پر بھوانی سنگھ نے نیرنگ کاکوروی کو افتخار الشعراء کے خطاب سے نوازا جس کی سند ۲۸؍اپریل ۱۹۲۸ء کو عطا ہوئی۔ علاوہ ازیں موصوف کے دیوان سرمایۂ افتخار نیرنگ کو نیر پریس لکھنؤ شائع ہونے کے واسطے بھیجا لیکن یہ ابھی پریس میں ہی تھا کہ بھوانی سنگھ نے رحلت کی اور اس کی اشاعت کی تکمیل ان کے فرزند راج رانا راجندر سنگھ مخمور کی تخت نشینی پر ۱۹۲۹ء میں ہوئی موصوف کا دیوان ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد، نعتیں، قصائد، تاریخی قطعات، خمسے، سلام اور کم وبیش ۲۳۱ غزلیں شامل ہیں۔ حضرت نیرنگ کاکوروی ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے زبان و بیان پر انھیں پورا عبور حاصل تھا۔ موصوف اپنے کلام میں بندش الفاظ اور اصول شاعری کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا کلام کلاسکیت اور قدیم انداز تغزل کا آئینہ دار ہے۔ جذبات کی ترجمانی اور معنویت کے اعتبار سے بھی ان کا کلام اپنی مثال آپ ہے

جلوہ ہے سپہر پہ پھر بدر کمال کا
چمکا ہوا ستارۂ قسمت ہے سال کا
یہ کہہ دو قیس سے اب دور ہے علم و فراست کا
سبق لے مکتب لیلیٰ میں آکر عقل و حکمت کا

معاصرین نیرنگ کاکوروی:۔

(۱) کیف ٹونکی:۔ معاصرین نیرنگ میں عالم گیر خاں کیف ٹونکی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ حضرت کیف حافظ قرآن اور نہایت متشرع انسان تھے۔ والیٔ جھالاواڑ راج ران بھوانی سنگھ کی فرمائش پر اپنے وطن ٹونک سے جھالاواڑ تشریف لائے تھے اور والیٔ مذکور کی قدر دانی کے سبب موصوف نے تمام عمر یہیں بسر کی۔ کیف ٹونکی کے دیگر سوانحی حالات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کے متعلق تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔ کیف کو فوق سے شرف تلمذ حاصل تھا

شاعری کے میدان میں کیف جھالاواڑ کے مشاعروں کے روح رواں بنے رہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، نعت، حمد، منقبت، قطعات اور تضمین ادب کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ کیف کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سلاست اور روانی ہے۔ جذبات کی ترجمانی بڑے دل کش انداز میں کرتے ہیں، جب کہ نیرنگ کاکوروی کے یہاں ایک منطقی پیرایۂ اظہار ادق الفاظ کا زیادہ استعمال ہوا ہے تاہم کیف اپنے ہم عصروں میں مولوی نیرنگ کاکوروی کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ جب کہ آغا شاعر قزلباش سے اکثر و بیشتر ان کی چوٹیں چلتی تھیں۔ کیف ٹونکی کا نعتیہ کلام دیوان کی شکل میں موجود ہے اب وہ بھی تقریباً نایاب ہو چکا ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں ایک قسم کی حلاوت، سرمستی اور موسیقیت پائی جاتی ہے:

در پر ترے جبریل نے آ کر شب معراج | پیغام دیا حق کا جگا کر شب معراج
قدم پا کر شفیع دو جہاں کا | زمیں بن بن گیا سر آسماں کا

(۲) آغا شاعر قزلباش: آغا شاعر قزلباش کا شمار داغ دہلوی کے تلامذہ میں ہوتا ہے بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی' آغا شاعر کا دیوان 'تیر ونشتر' کے نام سے شایع ہو چکا ہے اس کے علاوہ خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ 'خم کدہ خیام' کے نام سے بھی چھپ چکا ہے'۔ آغا شاعر نواب نصیر الممالک سفیر ایران کی مصاحبت میں بھی رہے اور وہاں سے موصوف کو افسر الشعراء کا خطاب بھی ملا۔اس کے بعد بھوانی سنگھ کی فرمائش پر جھالاواڑ تشریف لائے۔ جھالاواڑ آمد کے بعد نیرنگ کاکوروی اور کیف ٹونکی سے آغا شاعر کی معاصرانہ چشمکیں جاری رہیں،جن سے جھالاواڑ میں شاعری کے فروغ کے لئے ایک پر لطف اور ادبی فضا پروان چڑھی جو بہت کارآمد ثابت ہوئی۔علاوہ ازیں یہاں سے جاری ہونے والے رسالہ' آفتاب' کے مدیر بھی رہے اور کچھ عرصہ بعد جھالاواڑ سے واپس دہلی تشریف لے گئے۔جھالاواڑ میں کیف ٹونکی اور آغا شاعر قزلباش کے تلامذہ کا کوئی سلسلہ نظر نہیں آتا۔یہاں کے تمام شعراء نیرنگ کاکوروی سے ہی وابستہ رہے حضرت نیرنگ کاکوروی کے تلامذہ میں منشی سکندر خاں اثر،منشی رفیق بیگ تسلیم،منشی رفیق احمد تسنیم،عشرت علی عشرت، عزیزالرحمان عزیز،حافظ یٰسین شرر،عبدالعزیز،عبدالسلام بیگ شفیق جھالاواڑی،یوسف علی یوسف،شمبھو دیال دانش دہلوی،بابو شمبر ناتھ نشتر،مصطفی حسین رضوی،الٰہی بخش،حیدر حسین رضوی،حافظ عبدالخالق ساجد،منشی ظہورالدین ظہور،مبارک حسین رضوی،شریف الحسن شریف،محمد حسین رضوی رسا،راج رانا راجیندر سنگھ مخمور،(والی ریاست جھالاواڑ) منیر احمد یقین اور سید اسحاق علی اسحاق کے نام قابل ذکر ہیں۔ان شعراء میں دانش دہلوی کا دیوان کلیات دانش، راج رانا بھوانی سنگھ کی کوششوں سے ۱۹۲۶ء میں زیورطبع سے آراستہ ہوا اور والیٔ مذکور نے دانش کو ملک الشعراء کے خطاب سے بھی سرفراز کیا جو ہندوستان میں صرف شیخ ابراہیم ذوق کو ہی ملا تھا۔دانش دہلوی نے ازخود اس امر کا اعتراف اپنے دیوان میں یوں کیا ہے

۔۔۔۔علمی خطابات والیان ملک کی قدردانی نے عالموں کو دیئے اور ان کی ذاتی قابلیت نے حاصل کئے مگر ایسی مثال ایک بھی نہ ملی کہ ایک والیٔ ملک اپنے ایک ناچیز بندے کو برسوں اپنی فاضلانہ صلاحیتیوں سے اس کی شاعری کو زمانے کے موافق بنا کر ملک الشعراء کا خطاب عطا فرماتا ہے جو خاقانی ہند ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق کے بعد آج تک کسی کو نہ ملا(۱)

دانش کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازنا راج رانا بھوانی سنگھ کی فراخ دلی اور ادب پروری کا بیّن ثبوت ہے۔وہ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کی مقصدی اور افادی شاعری کی تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کی ہمنوائی میں ریاست جھالاواڑ میں موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی لہٰذا دانش دہلوی نے جو قدیم رنگ سخن کے حامل تھے ان کی تلقین اور فہمائش پر اپنا رنگ سخن بدلا۔سرسید احمد خاں کی ہدایات نے جس طرح مولانا حالی کے رنگ سخن کو بدلا تھا اسی طرح والی ریاست جھالاواڑ کی ترغیب نے دانش دہلوی کو نئی شاعری کی طرف متوجہ کیا اور اس طرح انھوں نے ملکی،سماجی،اصلاحی،مذہبی،تعمیری اور مقصدی نظموں پر مبنی وافر کلام کا ذخیرہ فراہم کر دیا۔

نیرنگ کاکوروی کے شاگردوں میں منشی سکندر خاں اثر جھالاواڑ نے ایک طویل مثنوی' بھیم چرتر' کے نام سے لکھی جو راشٹریہ بھاشا پرچار منڈل دہلی سے طبع ہوئی۔یہ مثنوی راجا بھیم سنگھ کی منظوم سوانح حیات ہے اس کا رسم الخط دیوناگری ہے تاکہ ہندی داں طبقہ بھی اس سے بہ یک وقت استفادہ کر سکے۔اس کے ہندی رسم الخط سے قطع نظر زبان و بیان اردو ہے۔مثنوی کا دیباچہ مولوی عبدالسلام بیگ شفیق جھالاواڑی نے سپرد قلم کیا ہے چنانچہ یہاں اس کا ذکر کرنا غیر مناسب نہیں ہے۔اثر جھالاواڑی کا دیگر کلام غیر مطبوعہ ہے

حافظ یٰسین شرر تلمیذ نیرنگ کی بھی ایک مثنوی' جنگ بھٹواڑہ' کے نام سے شائع ہو چکی ہے لیکن اس کا سن طباعت اور پریس کا نام معلوم نہیں ہوتا یہ مثنوی ۲۰۴ اشعار پر مشتمل ہے۔شرر نے اس میں والیٔ جے پور مادھو سنگھ اور ریاست کوٹہ کے فوج دار ظالم سنگھ اول کے مابین جنگ کے واقعات کو بڑے

مؤثر اور دل کش انداز سے بیان کیا ہے نثر جھالا واڑی کا دیگر کلام دستیاب نہیں ہوتا

اسی طرح والیٔ ریاست جھالا واڑ راج رانا راجندر سنگھ مخمورؔ تلمیذ نیرنگؔ کا دیوان غیر مطبوعہ شکل میں اہل خاندان کے ذاتی کتب خانے میں آج بھی موجود ہے ان کے علاوہ نیرنگ کے دیگر شاگرد تسلیمؔ، تسنیمؔ، عشرتؔ، عزیزؔ، عبدالعزیز، یوسفؔ، نشترؔ رضوی، الٰہی بخش، حیدر حسین رضوی، شریف رساؔ، ساجدؔ، ظہورؔ، مبارکؔ، اور اسحاق کا کلام غیر مطبوعہ ہے بلکہ بعض شعراء کا کلام اور سوانحی کوائف بھی اب دستیاب نہیں کیوں کہ ان میں سے زیادہ تر شعرائے کرام تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے اور وہیں پر انتقال فرمایا۔ چنان چہ یہاں ان کا سرسری ذکر بھی ممکن نہیں۔ البتہ پاکستان ہجرت کرنے والے شعراء میں منیر احمد یقین تلمیذ نیرنگ کا کوروی کا مجموعۂ کلام 'نیرنگ یقین' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں تاج محل پریس حیدرآباد سندھ سے شائع ہوا ہے جو بعد میں انہوں نے مجھے پاکستان سے ارسال کیا تھا، مذکورہ تلامذۂ نیرنگؔ میں مولوی عبدالسلام بیگ شفیقؔ جھالا واڑی، ساجدؔ، ظہور اور اسحاق کا ذکر بعد کے صفحات میں کیا جائے گا۔

۱۹۲۹ء میں راج رانا بھوانی سنگھ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند راج رانا راجندر سنگھ مخمورؔ گدی نشین ہوئے، انھوں نے تقریباً چودہ برس تک حکومت کی۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح اہل علم و ادب کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے چوں کہ وہ خود بھی شاعر تھے اور مخمورؔ تخلص کرتے تھے چنان چہ ان کا شعری ذوق اردو کے فروغ کا سبب بنا، لہٰذا انہوں نے بھی ایک ادبی تنظیم 'انجمن راجندر' کے نام سے قائم کی اور باقاعدہ اس تنظیم کے اراکین و ممبران مقرر کئے گئے۔ جناب مصطفیٰ حسین رضوی کو اس تنظیم کا سکریٹری مقرر کیا گیا لیکن ان کے انتقال کے بعد ۱۹۴۱ء میں مولوی عبدالسلام بیگ شفیقؔ جھالا واڑی تلمیذ نیرنگ کو 'انجمن راجندر' کا سکریٹری بنایا گیا اس تنظیم کے تحت جھالا واڑ میں ہر سال تین مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایک راج رانا راجندر سنگھ مخمورؔ کے جشن ولادت پر، دوسرا دسہرے کے موقع پر اور تیسرا ہولی کے تہوار پر۔ ان مشاعروں میں مشہور مقامی و بیرونی شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔ والیٔ ریاست خود بھی اپنے کلام سے محفل مشاعرہ کو گرماتے تھے۔ یہ سلسلہ راج رانا راجندر سنگھ مخمورؔ کے عہد حکومت تک قائم رہا لیکن اس کے بعد جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے تقسیم ہند کا سانحہ وجود میں آیا اور یہاں کے بیشتر شعراء ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہو گئے۔ دوسرا المیہ یہ رہا کہ مولوی نیرنگ کا کوروی نے بھی اس دارفانی سے کوچ کیا اور اس کے کچھ برس بعد جب راجستھان کا قیام عمل میں آیا تو سرکاری طور سے مشاعروں کا وہ انداز ہ رہا جو پہلے تھا تاہم اردو کا ذوق اور شعر و سخن کا چسکا باقی تھا چنان چہ ۱۹۷۱ء میں 'بزم نیرنگ' کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی گئی اس میں سرکاری سرپرستی کا عمل دخل نہیں تھا بلکہ شہر جھالا واڑ کے شعراء اس میں شامل رہے لہٰذا صدر اعلیٰ کے عہدے پر مولوی عبدالسلام بیگ شفیق جھالا واڑی تلمیذ نیرنگؔ مرحوم، صدر مصطفیٰ علی خاں شاکر رام پوری، سکریٹری سید اسحاق علی اسحاقؔ، نائب سکریٹری راحت گوالیاری اور خازن عبدالرحمان خلیقؔ جھالا واڑی مقرر ہوئے۔ جھالا واڑ میں نعتیہ اور بہاریہ مشاعرے بالعموم اسی تنظیم کے تحت ہوتے رہے جن کی رہنمائی مولوی عبدالسلام بیگ شفیق جھالا واڑی کیا کرتے تھے

صوبۂ راجستھان کے قیام کے بعد جب راجپوتانہ کی ریاستیں ختم ہو گئیں تو والیان ریاست کی ادب پروری اور سرپرستی جو کہ شاعروں کی حوصلہ افزائی کا باعث تھی روز بروز مفقود ہوتی چلی گئی اس کے علاوہ جھالا واڑ میں نیرنگ کا کوروی کے انتقال کے بعد مزید اثر ہوا۔ شعر و ادب کی محفلیں سرد پڑنے لگیں تاہم جھالا واڑ میں ان حالات کے باوجود شعر و شاعری کا کچھ ذوق برقرار رہا اور بالخصوص مولوی عبدالسلام بیگ شفیق جھالا واڑی نے اپنی گراں قدر کاوشوں سے یہاں کے شعراء کی رہ نمائی کر کے بستان سخن کی آبیاری کی چنان چہ نیرنگ کا کوروی کے بعد جھالا واڑ میں شعر و ادب کا ارتقاء شفیقؔ جھالا واڑی کا مرہون منت ہے۔

شفیقؔ جھالا واڑی کا تعلق ایک علم دوست خاندان سے رہا ہے موصوف کے دادا محترم اکبر بیگ صاحب جھالا واڑ کے قیام کے دوران راجہ مدن سنگھ کے ہمراہ مع اپنے خاندان کے جھالا واڑ تشریف لائے تھے موصوف نے عربی، فارسی کی تعلیم یہیں رہ کر نیرنگ کا کوروی سے حاصل کی

اوراس کے بعداعلا تعلیم کے امتحانات الہ آباد سے پاس کئے۔ حصول تعلیم کے بعد مہاراج ہائی اسکول میں اردو فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے ۳۷ سال کے عرصے کے بعد ملازمت ست سبکدوش ہوئے، شعروشاعری آپ کو ورثہ میں ملی تھی چنان چہ اصلاح کے لئے نیرنگؔ کاکوروی سے فیض سخن حاصل کیا۔ نتیجہ میں بہت جلد آپ نے ارتقا کی منزلیں طے کیں اور نیرنگؔ کاکوروی کے بعد استاد کہے جانے لگے۔ شفیقؔ جھالاواڑی نے حمد، نعت، غزل، قصیدہ، رباعیات ،قطعات، خمسے غرض ادب کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

خوابیدہ طبیعت نے نکالے ہیں وہ اشعار
سن سن کے جنھیں بزم سخن جاگ پڑی
وہ نہ قطرے کو اگر اتنی بڑائی دیتا
سیپ میں گوہر نایاب دکھائی دیتا

موصوف کا ایک مجموعۂ کلام 'انتخاب کلام شفیق' راجستھان اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ بقیہ کلام ابھی غیر مطبوعہ شکل میں اہل خاندان کے پاس محفوظ ہے۔ نیرنگؔ کاکوروی کے بعد ان کے بہت سے شاگرد شفیقؔ جھالاواڑی سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور بہت سے نئے شعراء مثلا قاری مسیح اللہ بیگ مسیحؔ، مظفرؔ جھالاواڑی، جلیل خاں جلیلؔ، راحتؔ گوالیاری، راقم الحروف، خیاط جھالاواڑی اور سعیدؔ شفیقی موصوف کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ شفیقؔ جھالاواڑی ایک نہایت مخلص اور خلیق انسان تھے۔ اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کی عادت میں شامل تھا چنان چہ موصوف کی موجودگی میں اکثر و بیشتر شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں اور درج بالا تمام موجودہ شعرائے کرام ان میں شریک ہوکرتے تھے، لیکن بدقسمتی سے ۱۹۸۷ء میں شفیق جھالاواڑی نے اس دارفانی کو خیر باد کہا۔ نتیجۃً ایک سال کے عرصہ میں یہاں کی شعری محفلیں سرد پڑ گئیں، لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ شاعری کے جراثیم کبھی ختم نہیں ہوتے لہٰذا از سر نو ادبی محفلوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری کیا گیا اور مندرجہ بالا موجودہ شعراء یہاں کی محفلوں کو زعفران زار بنانے لگے۔ اس ضمن میں امجد طاہر کا نام قابل ذکر ہے موجودہ شعراء میں امجد طاہر سب سے کم عمر اور نوجوان شاعر ہیں ان کے کلام میں بلا کی جدت اور کلاسیکیت موجود ہے۔ طاہر نے باقاعدگی سے اصلاح سخن کے لئے کسی کو استاد منتخب نہیں کیا صرف اپنے ذاتی مطالعہ سے ہی ارتقاء کے مدارج طے کئے ہیں لہٰذا بعض کہنہ مشق اور جواں فکر سخنور آج بھی جھالاواڑ میں شعروادب کی خدمت کر رہے ہیں اور حال کو ماضی کی تابناک کڑی سے جوڑے ہوئے ہیں

☆☆☆☆☆

حقنہ: معالجۂ فاضلہ ایک بہترین تاریخی فراموش شدہ طریقہ علاج

ڈاکٹرمحمد اکمل، ڈاکٹر شائنی ذوالفقار

ریڈر، شعبہ تحفظی وسماجی طب، یونیورسٹی کالج آف یونانی، ٹونک

حقنہ کی تاریخی حیثیت:

جہاں تک حقنہ کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ ایک قدیم ترین طریقۂ علاج ہے جس کا دنیا کے تمام طبوں خواہ وہ یونانی طب ہو آیورویدہو چینی طب ہو یا طب جدید ہو میں استعمال ملتا ہے۔ مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بحیثیت علاج ومعالجہ تمام ہی طبوں میں حقنہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ طبِ یونانی میں بھی زمانۂ قدیم سے ہی حقنہ بطور علاج ومعالجہ رائج رہا ہے۔

حقنہ کا موٗجد:

حقنہ کے موٗجد کے بارے میں اطباء ومؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ جمہور اطباء حکیم بقراؔط کو بغیر کسی شک وشبہ کے حقنہ کا موٗجد قرار دیتے ہیں جس کی تصدیق ابن سیؔنا کے ان الفاظ سے ہوجاتی ہے ''حقنہ کا دلچسپ آغاز بقراؔط کے دورِ زندگی سے اس طرح ہوتا ہے کہ ساحلِ سمندر پر وہ دیکھتا ہے کہ ایک مچھلی پڑی ہوئی ہے، جس کو نوچ نوچ کر ایک کوا پیٹ اتنا بھر لیتا ہے کہ وہ اڑنے سے مجبور ہوجاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بقراط جب دیکھتا ہے تو اس کے تعجب کی کوئی انتہاء نہیں رہتی کہ کوا اپنی چونچ میں سمندر کا پانی لے کر اپنی دبر میں داخل کر رہا ہے۔ چنانچہ اس عمل سے اس کے شکم کے فضلات بڑی مقدار میں خارج ہوجاتے ہیں اور وہ ہلکا پھلکا ہو کر اڑ جاتا ہے۔'' جب کہ بعض لوگ حقنہ کی ایجاد کو جالینوؔس (129-205AD) کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جو کہ بہت حد تک صحت سے دور ہے جیسا کہ شیخ الرئیؔس کے بیان سے واضح ہوجاتا ہے۔ لہٰذا حقنہ کے حقیقی موٗجد کے بطور بقراؔط کو تسلیم کر لینا چاہئے۔

حقنہ کے مترادفات:

(۱) دستور (۲) عمل (۳) وستی کرم (۴) عمل طائر (۵) انیما (۶) گلسٹر (۷) انیمیٹا

آلہ حقن / محقنہ / پچکاری:

بغرض حقنہ استعمال کئے جانے والے آلہ کو محقؔنہ کہتے ہیں۔ امتدادِ زمانہ کے لحاظ سے اس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں جیسے کہ آیوروید میں حقنہ کو وستی کرم کہا جاتا تھا۔ وستی کے لفظی معنی مثانہ کے ہیں اور آیوروید میں اس مقصد کے لئے جانوروں کا مثانہ استعمال کیا جاتا تھا اسی بناء پر اسے وستی کرؔم کہا جاتا تھا۔

یونانی اطباء میں سے بعض نے گائے کی دم جیسا آلہ استعمال کیا تو بعض نے کدو کی شکل کا آلہ مناسب سمجھا۔غرض یہ کہ کسی نہ کسی شکل میں حقنہ کا استعمال مختلف دور میں ہوتا رہا اور انیسوی صدی میں طب جدید نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا لہٰذا اسے بروئے عمل لایا گیا اور اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا جیسے ڈوش کین، اِرِیگیٹر (Irrigator) یا ڈوش سرنج (اینمل ڈوش یا گلاش ڈوش)۔

حقنہ کی تعریف:

بغرض علاج دواء کا براہِ مبرز امعاء مستقیم تک پہنچانے کو حقنہ کہتے ہیں اور طب جدید میں اس کو انیما (Enema) کا نام دیا گیا۔فضلات کو (آنتوں سے) خارج کرنے کے لئے اور انہیں اوپر سے نیچے کی طرف جذب کر کے بذریعہ مقعد ان مادوں کا اخراج کرنے کے لئے جو کہ مرض کا سبب ہوتے ہیں حقنہ ایک بہترین طریقۂ علاج ہے۔شیخ الرئیس نے حقنہ کو معالجۂ فاضلہ کہا ہے۔

حقنہ کی اقسام:

ضرورت اور مواقع استعمال کے لحاظ سے حقنہ کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں:

(۱) حقنہ مبدلۂ مزاج (۲) حقنہ ملینہ/مسہلہ (۳) حقنہ حابسہ/قابضہ (۴) حقنہ مخدرہ/مسکنہ (۵) حقنہ مغذیہ

(۶) حقنہ محللہ (۷) حقنہ قاتل دیدان (۸) حقنہ دافع تشنج (۹) حقنہ مملسہ

حقنہ مبدلۂ مزاج:

آنتوں میں سوءمزاج لاحق ہوجانے کی صورت میں جب اس کے افعال میں خلل لاحق ہوجاتا ہے تو آنتوں کے مزاج کو تبدیل کرنے کے لئے جس حقنہ کا استعمال کرتے ہیں اسے حقنہ مبدلہ مزاج کہتے ہیں۔

حقنہ ملینہ/مسہلہ:

آنتوں کو فاسد مادوں سے پاک کرنے کے لئے حقنہ ملینہ ومسہلہ کا استعمال ہوتا ہے یعنی حقنہ اگر آنتوں میں تلیین کے لئے استعمال کریں تو اسے حقنہ ملینہ اور اگر اسہال لانے کے لئے استعمال کریں تو اسے حقنہ مسہلہ کہتے ہیں۔

حقنہ حابسہ یا قابضہ:

ایسا حقنہ جو آنتوں میں قبض پیدا کرے اسے حقنہ حابسہ یا قابضہ کہتے ہیں۔اس میں حابس وقابض مزاج کی والی دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا استعمال اس حالت میں کرتے ہیں جب اسہال وغیرہ کا عارضہ لاحق ہوتا ہے خاص کر مزمن اسہالی مرض میں جیسے ذرب، پرانی پیچش وخونی پیچش وغیرہ۔اس کے استعمال سے مخاط کا آنا رک جاتا اور خون کی آمد منقطع ہوجاتی ہے۔

حقنہ مخدرہ ومسکنہ:

یہ حقنہ کی وہ قسم ہے جس کو آنتوں کے درد میں تسکین دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر اس میں مخدر و مسکن اثر رکھنے والی دواؤں کا استعمال ہوتا ہے جیسے پوست کوکنار، افیون وکاہو وغیرہ۔ اعورقولون اور امعاء مستقیم کے علاوہ گردہ، مثانہ اور رحم کے دردوں میں بھی اس قسم کا حقنہ استعمال کرتے ہیں۔

حقنہ مغذیہ:

کبھی کبھی ایسے حالات درپیش آتے ہیں کہ مریض کو برائے دہن غذا پہنچانا بہت دشوار ہوتا ہے اور اگر منہ کے راستے غذا پہنچائی جائے تو ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ رہتا ہے جیسے قئ مسلسل کی صورت میں اور امراض عقل وبیہوشی کی حالت میں۔ اس لئے ایسے حالات میں بذریعہ حقنہ غذا دی جاتی ہے جسے حقنہ مغذیہ کہتے ہیں۔

حقنہ محللہ:

تحلیل ورم کے لئے جو حقنہ استعمال کرتے ہیں اس کو حقنہ محللہ کہتے ہیں۔ اس میں محلل ورم اثرات رکھنے والی ادویہ کا استعمال کرتے ہیں جیسے لعاب حلبہ، حاشا، پودینہ اور آب مکوسبز وغیرہ۔

حقنہ قاتل دیدان:

جب حقنہ کا استعمال قتل دیدان امعاء کے لئے کیا جائے تو اسے حقنہ قاتل دیدان کہتے ہیں۔ بطور خاص اس کے ذریعہ دیدان صغار زحیطیہ کا قتل واخراج کیا جاتا ہے اس میں ایسی دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے جو قاتل دیدان اثرات رکھتی ہیں۔

حقنہ دافع تشنج:

وہ حقنہ جس کو امعاء کی تشنجی کیفیت کو دور کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ دراصل حقنہ مبدلہ مزاج میں داخل ہے۔

حقنہ مملسہ:

امراض قولون وامراض معاءِ مستقیم میں بعض اوقات رفع خراش کے لئے حقنہ میں لعابات استعمال کئے جاتے ہیں ایسے حقنہ کو حقنہ مسکنہ اور حقنہ مملسہ کہتے ہیں۔ اس میں لعاب ریشہ خطمی، لعاب برگ گاؤزبان، لعاب تخم خطمی، لعاب تخم کتاں، ماءالشعیر، نشاشتہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

حقنہ کے احکام وتدابیر:

(۱) حقنہ ہمیشہ گرمی وسردی کے لحاظ سے متعدل وقت میں کرنا چاہئے۔ ابن سینا حقنہ کے اوقات کے بارے میں القانون میں تحریر کرتے ہیں

کہ حقنہ کا صحیح وقت دونوں ٹھنڈے اوقات یعنی صبح وشام ہیں کیونکہ ایسے اوقات میں کرب و بے چینی کم ہوتی ہے۔علامہ قرشیؒ شارح قانونؔ نے بھی اس بات پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔

(۲) جس مریض کو حقنہ دیں کچھ ایسی تدبیر کریں کہ اس کو چھینک وکھانسی یا ہچکی نہ آئے۔

(۳) حقنہ مطلوبہ کے استعمال سے پہلے نیم گرم پانی اور مناسب روغنیات سے حقنہ کرنا چاہئے۔

(۴) حقنہ کا عمل آہستہ آہستہ کیا جائے ورنہ امعاء کے قبل از وقت سکڑنے سے حقنہ کا پانی خارج ہو جائے گا اور فضلات کا اخراج نہ ہو سکے گا۔

(۵) حقنہ کے لئے مستعمل دواء نیم گرم اور اس کا قوام معتدل ہونا چاہئے۔

(۶) حقنہ کا پانی ردواء کا وزن ایک پاؤ سے سواء پاؤ تک ہونا چاہئے۔بچوں اور بعض صورتوں میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔

وضع مریض بوقت حقنہ:

محتقن یعنی حقنہ لینے والے کے لئے بہترین وضع یہ ہے کہ وہ اس عمل کے وقت بائیں کروٹ پر لیٹ جائے۔بائیں ٹانگ کو دراز کرے اور دائیں ٹانگ کو سمیٹ کر شکم کی طرف لے جائے اور اس حالت میں حقنہ آسانی کے ساتھ داخل کیا جاسکتا ہے۔اس عمل کے بعد سرین کو تکیہ وغیرہ سے بلند رکھنا چاہئے تاکہ دواء مقررہ مدت تک کے لئے رک سکے اور جلد خارج نہ ہو جائے۔حقنہ کے بعد مریض کو اوندھا کر کے سجدہ کی صورت میں رکھ کر مبرز کو کپڑے سے حسب ضرورت دبا دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف امراض کے لحاظ سے وضع کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جیسا کہ حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی نے اصولِ طب میں ذکر کیا ہے۔

امراض دماغ:

اس حالت میں مریض کو چت لٹائیں اور سر و گردن کے نیچے تکیہ رکھیں۔

دردمعدہ، امعاء وقولنج:

ایسی حالت میں مریض کو گھٹنے کے بل لٹائیں اور اس کے شکم کو اونچا رکھیں۔سر و سینہ کو تکیہ پر رکھیں۔

دست وپیچش:

ایسی حالت میں تکیہ پشت کے نیچے رکھیں اور مریض کو چت لٹائیں۔

امراض گردہ:

امراض گردہ میں بھی مریض کو چت لٹائیں اور سرین کے نیچے تکیہ رکھیں۔

نسخہ جات بغرض حقنہ:

(۱) حقنہ برائے قبض وقولنج شدید:

نسخہ ۱: صابن ۳ ماشہ، روغن بیدانجیر ۳ تولہ، آب نیم گرم ڈیڑھ کلو

طریقہ تیاری واستعمال: صابن کو آب نیم گرم میں حل کر کے روغن بیدانجیر کا اضافہ کر کے حقنہ دیں۔

نسخہ ۲: صابن ۲ ماشہ، عرقِ گلاب ۲۵۰ ملی لیٹر، آب نیم گرم ڈیڑھ کلو

طریقہ تیاری واستعمال: صابن کو آب نیم گرم میں حل کر کے عرقِ گلاب کا اضافہ کر کے حقنہ دیں۔

(۲) حقنہ برائے نفخ وقبض ودیدان:

نسخہ: روغن تارپین ۲۰۵ تولہ، روغن زیتون ۱۰ تولہ، آب نیم گرم ڈیڑھ کلو۔

طریقہ تیاری واستعمال: روغنیات کو آب نیم گرم میں حل کر کے حقنہ دیں۔

(۳) حقنہ غذائی:

اس میں یخنی یا اراروٹ یا انڈے کو دودھ میں ملا کر ۱۵۰-۲۰۰ ملی لیٹر کی مقدار میں ہر ۶ گھنٹہ کے بعد غذائی مقصد کے لئے استعمال کریں۔

(۴) حقنہ لینہ:

نسخہ ۱: عناب، سپستاں، گل بنفشہ، خطمی، اکلیل الملک جو مقشر نیم کوب وگیہوں کی بھوسی ہر ایک ایک تولہ، انجیر زرد ۵ عدد، آب ڈیڑھ سیر، شکر سرخ ۵ تولہ، روغن بنفشہ ایک تولہ ۵ء۵ ماشہ، روغن بادام وروغن کنجد ہر ایک ۲ تولہ ۱۱ ماشہ۔

نسخہ ۲: مذکورہ بالا نسخہ کو زیادہ قوی بنانے کے لئے اس میں مغز املتاس اور سناء مکی ایک ایک تولہ کا اضافہ کریں۔

طریقہ تیاری واستعمال: تمام ادویہ کو ڈیڑھ سیر پانی میں جوش دیں جب آدھ سیر رہ جائے تو چھان کر شکر سرخ ملا کر روغن بنفشہ، روغن بادام وروغن کنجد اضافہ کر کے نیم گرم دو مرتبہ حقنہ کریں اس کو زیادہ قوی بنانے کے لئے مغز املتاس اور سناء مکی کا اضافہ کریں۔

(۵) حقنہ برائے پیچش:

چاولوں کا جوشاندہ (پیچ) بقدر ضرورت کو تازہ دودھ بقدر ضرورت کے ہمراہ پکائیں یہاں تک کہ غلیظ ہو جائے پھر تھوڑا سا کیکر کا گوند ملا کر حقنہ

کریں۔

مقدارسیال بغرض حقنہ:

مقدارسیال کے متعلق اطباءقدیم وجدید میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اطباءقدیم کے مطابق نوجوانوں میں ۳۰-۴۰ تولہ تک سیال آنتوں میں پہنچانے کی اجازت ہے۔وہ دن رات (۲۴ گھنٹے) میں دوتین مرتبہ تک اس عمل کو جائز قرار دیتے ہیں۔جب کہ اطباءجدید جوان آدمی میں ۲ سیر تک سیال آنتوں میں پہنچانے کی اجازت دیتے ہیں۔

تلیین واسہال کی غرض سے مستعمل سیال کی مقدار زیادہ ہونی چاہئے تا کہ دورتک اس کے اثرات پہونچیں اور جب حقنہ غذائی یا آنتوں کے زخموں وغیرہ کے لئے حقنہ دوائی دیا جائے تو ضروری ہے کہ اس میں سیال کی مقدار کم ہوتا کہ آنتوں میں زیادہ دیر تک ٹھہر سکے اور جلد خارج نہ ہوجائے۔ لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ عورتوں اور بچوں میں ہرصورت میں سیال کی مقدار مقررہ مقدار سے کم ہونی چاہئے۔

اندرونِ امعاء حقنہ کے ٹھہرنے کی مدت:

عام طور پر حقنہ کے اندورن امعاء ٹھہرنے کی مدت ۳-۴ منٹ کافی ہے مگر امراض مزمنہ میں خصوصاً حقنہ میں مستعمل سادہ پانی ۱۰-۲۰ منٹ تک روکنا چاہئے۔

وہ امور جن کا لحاظ رکھنا قبل حقنہ ضروری ہے:

(۱) حقنہ سے پہلے یہ یقین کر لینا چاہئے کہ مریض کے اعضاء رئیسہ میں ضعف یا کوئی دوسری بیماری تو نہیں ہے۔اگر ایسا ہے تو پھر حقنہ کی دوائیں تیز نہیں ہونی چاہئیں۔لیکن اگر تیز دواؤں کی ضرورت ہو تو کم مقدار میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(۲) حقنہ کے لئے مناسب وقت وہ ہے جب غذا معدہ سے گذر چکی ہو۔اگر رات کو سوتے وقت دیا جائے تو اور بھی اچھا ہے کیوں کہ سکون کی حالت میں طبیعت مرض سے مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ مستعد ہوتی ہے۔

فرائض بعد حقنہ:

حقنہ کے بعد مقوی غذا نہ دے کر نرم غذا تھوڑی مقدار میں دینا بہتر ہے۔لیکن اگر کوئی خاص ضرورت ہو تو مرض کی مناسبت سے دوا دینی چاہئے،حقنہ کے بعد عام طور پر مریض کو کسی قسم کی تکلیف یا کمزوری محسوس نہیں ہوتی بلکہ طبیعت کی گرانی، پیٹ کی چبھن وریاحی دردجیسی تکلیفیں رفع ہو کر طبیعت صاف اور ہلکی ہوجاتی ہے۔ پیشاب بھی کھل کر ہوجاتا ہے۔البتہ بعض اوقات کچھ معمولی سی کمزوری محسوس ہوتی ہے ایسی صورت میں مناسب مقوی مرکبات استعمال کرائے جاسکتے ہیں۔

حقنہ کے اثرات رنوعیت عمل:

حقنہ مختلف امراض میں دوطرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔ (۱) بلاواسطہ (۲) بالواسطہ

بلاواسطہ:

بلاواسطہ اثر انداز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آنتوں کی تقریباً تمام شکایات میں براہ راست حقنہ کا اثر مرتب ہوتا ہے مثلاً قولنج، قبض، دردمعدہ، نفخ وقراقر وغیرہ۔

بالواسطہ:

بالواسطہ اثر کرنے کی صورت یہ ہے کہ جب آنتوں میں فضلات محتبس ہوکر عفونت پیدا کرتے ہیں اور زہریلے مادے خون میں جذب ہوجاتے ہیں جوکہ اعضاء میں پہنچ کر خرابیوں کا باعث بنتے ہیں۔ اوراحتباس کے سبب مسلسل اسی قسم کے زہریلے اجزاء جذب ہوکر دوسرے اعضاء میں امراض پیدا کرتے ہیں یا پیدا شدہ امراض میں اضافہ کرنے کا سلسلہ قائم رکھتے ہیں اس صورت میں حقنہ کا استعمال آنتوں کے فضلات نکالنے اور جسم کے زہریلے اجزاء خارج کرنے کے علاوہ قریبی اعضاء میں پیدا ہونے والی بیماریوں کو رفع کرنے میں مدد دیتا ہے۔ قریبی اعضاء کے امراض کو دفع کرنے میں جو امداد ہوتی ہے وہ دراصل بالواسطہ طور پر ہوتی ہے۔

حقنہ کے فوائد:

بعض حالات میں حقنہ تمام دوسرے طریقۂ علاج سے زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے اور بعض امراض ایسے بھی ہیں جن کے اعراض میں سکون پیدا کرنے کے لئے حقنہ مؤثر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض بیماریوں میں حقنہ کے علاوہ کوئی دوسرا علاج مؤثر نہیں ہوتا اس لئے علاج کے مختلف طریقوں میں حقنہ کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

(۱) گلے اور منہ کی بعض بیماریوں میں مریض غذا نہیں کھاسکتا جبکہ بدن کو غذا کی یقینی طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں حقنہ مریض کو غذا پہنچانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

(۲) جب مریض کی نبض ساقط ہونے کے قریب ہو اور دوا حلق سے نہ دی جاسکے تو ایسی حالت میں ۵ تولہ شراب کو ۱۰ تولہ گنگنے پانی میں ملاکر حقنہ کردیا جاتا ہے۔ یہ سیال خون میں فوراً شامل ہوجاتا ہے اور قوت عود کرآتی ہے۔

(۳) بعض حالات میں جب آنتوں میں براز بند ہوجاتا ہے یا سدے پڑ جاتے ہیں تو ان سدوں کو دور کرنے کے لئے حقنہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

(۴) بدمزہ اور بدبودار دوائیں کہ جن میں بعض کا پینا تو ایک طرف منہ تک لے جانا بھی مشکل ہوجاتا ہے لیکن ضرورت کے پیش نظر پینی پڑتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منہ بدمزہ ہوجاتا اور ابکائیاں وقے آجاتی ہے جس کے ذریعہ دوا بھی باہر ہوجاتی ہے اس طرح دوا کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوپاتا۔

ایسی حالت میں اگر حقنہ سے دوا آنتوں میں پہنچا دی جائے تو اس سے پورا فائدہ تو حاصل ہوتا ہی ہے ساتھ ہی مریض تلخیٔ دہن اور دوا کی بدمزگی کی تکالیف سے بھی نجات پا جاتا ہے۔

(۵) ملین و مسہل ادویات بذریعہ دہن دینے پر ان دواؤں کے اثرات کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ان دواؤں کے ہضم ہو جانے یا عمل نہ کرنے کی صورت میں ان کے خطرناک اثرات کا خیال نیز ناقص جلاب کے برے اثرات کا خوف بھی لگا تار بنا رہتا ہے۔ جلاب میں کبھی کبھی رطوبات فاسدہ کے ساتھ ساتھ رطوبت اصلیہ کے بھی خارج ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اور سب سے بڑی مشکل ہے کہ جلاب کے موزوں موسم کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے جب کہ حقنہ کی صورت میں ان اندیشوں کا کوئی خوف نہیں رہتا ہے۔

(۶) حقنہ، مسہل ادویہ کے بذریعہ دہن استعمال کرنے کے بالمقابل اس لئے بھی بہتر ہے کہ ضرورت پڑنے پر ایک دن میں ۳-۴ مرتبہ تک حقنہ کرا سکتے ہیں جب کہ ایک دن میں دو مسہل نہیں دئے جا سکتے۔

حقنہ سے اگر چہ معمولی حالات میں معاء مستقیم کے مواد و فضلات خارج ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ اس سے بالائی آنتوں کے فضلات بھی خارج ہوا کرتے ہیں اس لئے یہ کہنا بہت حد تک درست ہے کہ حقنہ پوری آنت کی صفائی کے لئے ایک بہترین تدبیر ہے۔

حقنہ کے نقصانات:

(۱) تیز حقنوں سے ضعف جگر پیدا ہوتا ہے اور تپ عارض ہو جاتا ہے۔

(۲) حمام سے پہلے حقنہ نہیں کرنا چاہئے۔ حمام کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے اخلاط میں میں روانی اور احتراق پیدا ہو جاتا ہے۔

(۳) حقنہ کسی قسم کا نقصان پیدا نہیں کرتا بشرطیکہ وقتِ ضرورت اصول کی پابندی کے ساتھ کیا جائے۔ اگر سخت تحریک پیدا کرنے والی دواؤں کا استعمال بلاضرورت بہت دنوں تک کیا جائے تو آنتوں میں التہاب یا خشکی پیدا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔

(۴) اگر پاخانے کی جگہ زخم یا بواسیری مسّے ہوں اور ایسی حالت میں بداحتیاطی کے ساتھ حقنہ کیا جائے تو پھر مضر اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔

(۵) اگر بلغمی مرض کی موجودگی میں زیادہ دنوں تک سادہ پانی کا حقنہ دیا جائے تو مضر ہے۔

حقنہ کے متعلق شکوک وشبہات:

حقنہ کی افادیت واہمیت کے باوجود اس کے متعلق چند شکوک وشبہات ہیں اسلئے مناسب ہے کہ ان شکوک کا ازالہ بھی کر دیا جائے جیسے:

(۱) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حقنہ غیر فطری طریقۂ علاج ہے لیکن اس اعتراض کے ساتھ ان کے ذہن میں یہ چیز نہیں آتی کہ یہ امراض بھی غیر فطری ہوا کرتے ہیں اور ان کو دور کرنے کے لئے ہر ممکن تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔

(۲) حقنہ کے متعلق دوسرا شک یہ ہے کہ اس سے آنتوں کی مخاطی رطوبات ڈھل سکتی اور اس رطوبت کے نہ ہونے کی وجہ سے آنتوں میں زخم پڑ

سکتے ہیں لیکن اس شک میں کوئی وزن نہیں ہے اس لئے کہ بمقابلہ حقنہ مسہل وملین دواؤں کے استعمال سے یہ رطوبت کہیں زیادہ ڈھل جاتی ہے۔ البتہ یہ چیز قابل تسلیم ہے کہ زیادہ حالی اور تیز دواؤں کے مسلسل استعمال سے آنتوں کو نقصان پہنچنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے لیکن یہ دونوں ہی حالت میں ہوسکتا ہے چاہے مسہل وملین کے لئے تیز دواؤں کا استعمال بذریعہ دھن یا بذریعہ حقنہ ہو۔

(۳) حقنہ کے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ اس سے آنتوں میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حقنہ سے آنتوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ مزمن امراض میں مریض کو صرف سادہ پانی کا حقنہ دیا جاتا ہے جس سے آنتوں میں قوت پیدا ہوجاتی ہے۔

تتمہ:

دورِ حاضر جو کہ انسانی ہمزاد بنانے کی تگ ودو میں مصروف ہے اور چاند پر پانی کی تلاش ہوچکی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہاں گھروندہ تعمیر کرنے کیلئے آراضی کی تخصیص تک عمل میں آچکی ہے۔ غرضیکہ انسان ان منازل ترقی کو طے کر چکا ہے جن کا تصور بھی چند سالوں قبل ناممکنات میں سے تھا۔ اس ترقی کی دوڑ میں اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا تک روا نہیں رکھا۔ ان صورتِ حال کیوجہ سے اس نے ان اعمال اور طریقۂ کار کو بھی یکسر فراموش کردیا جو انسانی صحت کی بہتری میں معاون ہوسکتے تھے اور جنھیں قصۂ پارینہ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ان طریقہائے صحت کو آج بھی وہی اہمیت دینی پڑے گی جو صدیوں پہلے تھی۔ ایسا ہی ایک متروکہ معالجاتی طریقۂ کار حقنہ ہے جسے حاملینِ طب یونانی نے تو فراموش کردیا ہے لیکن آج کا ترقی یافتہ انسان مختلف معالجاتی وجراحیاتی اعمال کی بہتری اور غیرعوارضاتی علاج کے پیشِ نظر اس طریقہ کو بروئے عمل لا رہا ہے۔ ایسی صورت میں ہم طالب علموں، معالجین ومؤلفین طب یونانی کو بھی چاہئے کہ اپنی متاعِ گم گشتہ کے بطور اس معالجۂ فاضلہ کو پھر سے معرضِ وجود میں لاکر انسانیت کو اس کے فوائد سے ہمکنار کریں۔ واللہ ھو مسبب الاسباب۔

مراجع ومصادر:

۱- شیخ الرئیس علی ابن سینا۔ القانون فی الطب (اردو ترجمہ حکیم سید غلام حسنین کنتوری)۔ نئی دہلی: ادارہ کتاب الشفاء؛ 20-219۔

۲- شیخ الرئیس علی ابن سینا۔ کلیاتِ قانون (اردو ترجمہ وشرح حکیم علامہ محمد کبیر الدین)۔ نئی دہلی: ادارہ کتاب الشفاء؛ 20-219۔

۳- علامہ علاء الدین قرشی۔ افادۂ کبیر مجمل (اردو ترجمہ حکیم کبیر الدین)۔ دیوبند، سہارنپور: فیصل پبلیکیشنز؛ 214-212۔

۴- علامہ محمد کبیر الدین۔ کلیات نفیسی۔ نئی دہلی: ادارہ کتاب الشفاء؛ 1954:17-516۔

۵- اشہر قدیر۔ تاریخ طب واخلاقیات۔ طبع سوم۔ دہلی: ربانی پرنٹرس؛ 100:2005۔

۶- سید کمال الدین حسین ہمدانی۔ اصول طب۔ طبع اول۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان؛ 1998:462-458۔

۷- حکیم فضل مبین احمد۔ حقنہ۔ ہمدرد صحت جنوری 1941:14-13۔

۸- حکیم فضل مبین احمد۔حقنہ۔ہمدردصحت فروری 1941:16-17۔

۹- حکیم فضل مبین احمد۔حقنہ۔ہمدردصحت مارچ 1941:22-23۔

۱۰- احسان اللہ،عنایت اللہ۔علاج بالتدبیر۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان؛2006:180۔

۱۱- www.wikipeadia.com

۱۲- www.healthbonguet.com

خواتین اور اردو فکشن

ڈاکٹر ای اے حیدری
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اردو گورنمنٹ لوہیا پی جی کالج چورو

کائنات عالم میں ابتدائے تخلیق سے عورت کی شخصیت غیر معمولی قدر و قیمت کی حامل رہی ہے۔انسانی وجود کی نشو ونما سے لے کر معاشرے کی تشکیل تک عورتوں کی خدمات کا جو طویل سلسلہ ہے اس سے انکار ناممکن ہے پھر بھی عہد قدیم سے آج تک اس کے ساتھ اکثر و بیشتر انصاف سے کام نہیں لیا گیا تمام تر شعبہ ہائے زندگی میں عورت کو ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا عورت کی اسی مظلومیت کو بیان کرتے ہوئے عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ

> 'اسے محکوم رکھا گیا۔مرد کی حلقہ بگوشی سے وہ باہر نہ نکل سکی، کہیں وہ پیدا ہوتے ہی قتل کی گئی، کہیں زندہ دفن کردی گئی، کہیں اسے مردہ خاوند کے ساتھ زندہ جلنا پڑا، کہیں اس کی شادی اس طرح کی گئی جیسے مجرم کو کوئی سزا دیتا ہے کہیں بیوگی کے عالم میں دنیا اس کی چھاتی پر مونگ دلتی ہے'(۱)

ویدک دور میں عورت کی حالت قدرے بہتر دکھائی دیتی ہے مگر ویدک دور کے بعد عورت کی سماجی حیثیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ساتویں صدی عیسوی تک آتے آتے عورتوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی نظر آتی ہے منوسمرتی کے قوانین کے زیر اثر عورت کو سانپ اور زہر جیسے القاب سے نوازا گیا۔مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی عورتوں کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہو سکی اگرچہ اسلام نے عورت کو وہ تمام حقوق دیئے تھے جن کی بناء پر اسے معاشرے میں مردوں کے برابر کا درجہ حاصل ہو سکتا تھا مگر عملی طور پر مسلمانوں میں یہ تصور بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔مردوں نے اپنا تسلط و برتری قائم رکھنے کے لئے عورتوں کے حقوق کو پامال کرنا شروع کر دیا۔انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں یہی صورت حال دکھائی دیتی ہے انیسویں صدی کا نصف آخر خواتین کے لئے ایک فال نیک ثابت ہوا ۱۸۵۷ء کا سیاسی انقلاب ایک تاریخی حادثہ نہ تھا بلکہ خواتین کے لئے ایک نئی صبح کی بشارت ثابت ہوا۔مغربی تہذیب و تمدن کی بالادستی کے سبب ستی، جہیز، بیوگی اور تعلیم نسواں وغیرہ موضوعات پر نئے انداز سے غور و فکر کا ماحول پیدا ہوا اور خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو جدید حالات کے تناظر میں دیکھنے اور اسے دور کرنے کی جدو جہد کی گئی۔خواتین کو ناانصافی، سماجی نابرابری اور ظلم و جبر سے محفوظ رکھنے کے لئے ہمارے ملک میں متعدد اصلاحی تحریکیں بھی وجود میں آئیں ان تحریکوں کے سبب خواتین کو فائدہ پہنچا۔برٹش حکومت نے بھی قوانین کا نفاذ کر کے حالات کو بہتر بنانے میں مدد دی۔برطانوی حکومت نے دختر کشی کو قانونا جرم قرار دیا۔۱۹۲۹ء میں شاردا ایکٹ کے نام سے ایک قانون پاس ہوا جس میں کم سنی کی شادی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ریاست بڑودہ نے ۱۹۴۲ء میں تعدد ازدواج کے خلاف ایک قانون پاس کیا اس طرح برطانوی سامراج اور ہندوستانی مصلحین کی کوششوں کے نتیجے میں خواتین کو ظلم و ستم سے نجات ملی اور انہیں مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوئے تو خواتین نے ادب و تعلیم سے لے کر سیاست کے میدان تک مردوں کے دوش بدوش حصہ لینا شروع کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے حقوق کی بحالی کے لئے آواز بلند کی۔

بیسویں صدی میں فکشن کے حوالے سے جن خواتین نے اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کی یا زندگی اور سماج کے دھارے کا رخ موڑنے کی

کوشش کی ان میں ڈاکٹر رشید جہاں کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔انگارے میں ان کے دو افسانے پردے کے پیچھے اور دلی کی سیر شامل ہیں اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں ان کی نو کہانیوں کا ایک مجموعہ عورت اور دیگر افسانے طبع ہوا جس میں رجعت پسندانہ رویہ کے خلاف ایک واضح نقطۂ نظر موجود ہے ان کے افسانوں نے خواتین افسانہ نگاروں کی نئی نسل کو متاثر کیا عصمت، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر تک کے افسانوں پر رشید جہاں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں کچھ کے عناوین سلمٰی، سودا، غریبوں کا بھگوان، استخارہ، مجرم کون، فیصلہ، آصف جہاں کی بہو، وہ، ساس اور بہو، چور، اندھے کی لاٹھی، انصاف اور بے زبان وغیرہ ہیں ان کے افسانوں میں تکنیکی خامیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس حقیقت کا اعتراف لازمی ہے کہ انہوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے سماج کی بے راہ روی کے خوبصورت مرقعے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔

اسی عہد کا دوسرا اہم نام عصمت چغتائی کا ہے جنہوں نے نہایت کم سنی سے ہی کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں ان کی بیشتر ابتدائی کہانیاں ساقی میں شایع ہوئیں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کے درمیان عصمت نے افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں لحاف اور دوزخی منظر عام پر آئے جن کی اشاعت کے بعد عصمت کی کہانیوں پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا اور بعضوں نے تو انہیں فحش نگار تک کہہ ڈالا لیکن عصمت نے ایسے افراد کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ان کی کہانی لحاف کی بدولت ہی انہیں شہرت دوام ملی۔

عصمت کے نصف درجن سے زائد افسانوی مجموعے، ناول اور ناولٹ شایع ہو چکے ہیں علاوہ ازیں ڈراموں کے دو مجموعے اور ایک سوانحی ناول 'کاغذی ہے پیرہن' بھی طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

عصمت کو صرف فحش نگار کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ان کے افسانوں میں جنسی پیچیدگی سے زیادہ ان محرکات وعوامل کا بیان ہے جو ہمیں زندگی کی ناہمواریوں سے روشناس کراتے ہیں۔حقیقت یہ کہ عصمت سماجی ناہمواریوں کی فکشن نگار ہیں ان کے ناولوں میں ان کے خلاف احتجاج کی فضا بھی دکھائی دیتی ہے، انہیں ہماری روایتی طرز معاشرت جس میں بہت سی پابندیاں موجود ہیں پسند نہیں، وہ تو ہمہ وقت آزاد فضا میں پرواز کرنا چاہتی تہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بعض افسانوں میں ان سماجی اور معاشرتی رویوں کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اسے نیست ونابود کرنے کی کوشش کی ہے جس کی نمایاں ترین مثال ان کا افسانہ 'دو ہاتھ' ہے جس میں ناجائز بچے کو اس کے پسماندہ وغریب گھر والے صرف اس لئے قبول کر لیتے ہیں کہ یہ دو ہاتھ مستقبل میں ان کا سہارا بن سکتے ہیں۔عصمت کو عموماً ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ سماجی، معاشرتی واخلاقی ضابطوں کی شکست وریخت کے بعد ہماری کیا صورت ہوگی وہ تو ان سماجی، معاشرتی اور اخلاقی ضابطوں کو راستے کی ایک زنجیر سمجھتی ہیں جسے توڑ دینے میں انہوں نے اپنی قوت صرف کی ہے۔

آزادی قبل شہرت پانے والی خواتین فکشن نگاروں کی فہرست میں رضیہ سجاد ظہیر کا نام بھی شامل ہے انہوں نے سجاد ظہیر سے شادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔وہ افسانہ نگاری میں پریم چند اسکول کی نمائندگی کرتی ہیں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ زرد گلاب ہے جس میں ۱۸/افسانے اور خاکے شامل ہیں ان میں بعض علامتی انداز کے بھی ہیں ان کے اہم ترین افسانوں میں نمک، واردات، پت جھڑ میں پھول، دو دل ایک داستان اور زرد گلاب وغیرہ شامل ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع صاف نمایاں ہے۔انہوں نے خانگی زندگی سے لے کر عالمی ایٹمی خطرات تک کو نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'اللہ دے بندہ لے' بھی اہمیت کا حامل ہے

جس میں کہیں غریبوں کی خودداری، مذہبی رسم ورواج، اتر پردیش کا اسلامی ماحول، ضعیفی کی نفسیاتی کیفیتیں، مذہبی اتحاد واتفاق کے پہلو، زندگی میں نمائشی انداز، فطرت کی تباہی و بربادی وغیرہ مناظر کے علاوہ موجودہ عہد کے انسانوں میں بڑھتا ہوا تنہائی، مایوسی اور بے بسی کا احساس وغیرہ موضوعات کا خوبصورت بیان موجود ہے۔

جہاں تک رضیہ سجاد ظہیر کے ناولوں کا تعلق ہے سر شام، کانٹے، سمن، اللہ میگھ دے، وغیرہ اہم ہیں سر شام ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آیا تھا جس میں مڈل کلاس طبقے کی مصنوعی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے جب کہ سمن میں متمول اور جاگیردارانہ سماج کے گھناونے پن اور طبقاتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ میگھ دے میں گومتی کے سیلاب کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں انسانی بے بسی، سماجی رشتوں، تعلقات اور نجی جذبات وغیرہ کے خوبصورت مرقعے پیش کئے ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر کے ناولوں کے مطالعے کے بعد بلاشک وشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہیں کہانی کہنے کا فن آتا ہے وہ اپنی کہانیوں میں کھل کر کسی پر طنز نہیں کرتیں بلکہ خامیوں اور کمزوریوں کی بابت ہلکا سا اشارہ کرتی ہیں جو مکمل فنی احساس کے ساتھ ہوتا ہے زبان و بیان کی سطح پر بھی رضیہ سجاد ظہیر دوسری خواتین کے مقابلے بہتر معلوم ہوتی ہیں۔

نذر سجاد حیدر کا شمار بھی بیسویں صدی کی اہم خواتین فکشن نگاروں میں ہوتا ہے انہوں نے بے حد فعال زندگی بسر کی۔ تمام زندگی اصلاح سماج ومعاشرہ کی کوششوں میں صرف کی، انہیں مسلم خواتین کی زبوں حالی کا ہمیشہ خیال رہا، انہوں نے مسلم خواتین کو جہالت کے اوہام سے نکال کر تعلیم کے میدان میں لاکر یقین واعتماد سے ہم کنار کرنے کی جو کوشش کی اس کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ ان کی دختر قرۃ العین حیدر نے ان کے ناولوں کو یک جا کر کے 'ہوائے چمن میں خیمۂ گل' کے عنوان سے شایع کرایا تھا اور اس پر ایک طویل دیباچہ بھی تحریر کیا تھا اس مجموعہ میں ان کے سات ناول ہیں جن کے عناوین اختر النساء بیگم، عرفان نصیب، آہ مظلوماں، جاں باز، ثریا، نجمہ اور مذہب عشق وغیرہ ہیں ان میں آہ مظلوماں کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے کسی دوسرے ناول کو نہ ہوئی۔ ان کے یہ تمام ناول ان کے عہد کے سماج کا آئینہ ہیں ان میں ہر جگہ ان کے اصلاحی جذبے کی کارفرمائی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فن کے اعتبار سے یہ ناول بہت زیادہ معیاری نہ سہی لیکن ان میں خواتین کی ابتر صورت حال پر مصنفہ کے دل میں درد کی جو لہریں اٹھتی ہیں انہیں صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

صالحہ عابد حسین کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا لیکن ادبی دنیا میں انہوں نے صالحہ عابد حسین کے نام سے شہرت حاصل کی ان کا پہلا افسانہ 'لمبی داڑھی والا بوڑھا پوپ' شایع ہوا اس کے بعد ادب لطیف، سویرا، نقوش، ساقی، مخزن اور علی گڑھ جیسے رسائل وجرائد میں مسلسل ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں ان کے ناولوں میں عذرا، آتش خاموش، قطرے سے گہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، راہ عمل، اپنی اپنی صلیب، الجھی ڈور، ساتواں آنگن اور گوری سوئے سیج پر وغیرہ ہیں۔ افسانوی مجموعوں میں نقش اول، ساز ہستی، نراس میں آس، درد درماں، تین چہرے اور تین آوازیں وغیرہ شامل ہیں۔ یادگار حالی اور انیس کے مرثیوں کی ترتیب وتدوین بھی ان کے اہم ترین کارنامے ہیں جن سے صرف نظر ادبی دیانت داری کے منافی ہے۔ ان کی ناول نگاری پر ڈاکٹر کہکشاں پروین نے اپنے تحقیقی مقالے میں کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

صالحہ عابد حسین کے ناولوں کا خمیر ہندوستانی سماج میں شادی بیاہ کے مسائل، جہیز کی لعنت، طلاق کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خرابیوں اور شوہروں کی بے وفائی و بے حیائی کے بیان سے تیار ہوا ہے۔ ان کی فنی مہارت، تخلیقی صلاحیت، وسعت مطالعہ کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان

کے افسانے انقلاب کی صورت حال سے دور ہیں ان کے یہاں تکنیک کی سطح پر بھی بہت کچھ نیا دیکھنے کو نہیں ملتا۔

قرۃ العین حیدر اردو کی نمائندہ خاتون فکشن نگار ہیں ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد حیدر کا نام اردو فکشن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے محتاج تعارف نہیں۔قرۃ العین حیدر کی ابتدائی زندگی پر والدین کی ادبی زندگی کے اثرات مرتب ہوئے جس کے نتیجے میں انہوں نے محض چھ سات برس کی عمر میں پہلی کہانی ’کاٹھ گودام کا اسٹیشن‘ تحریر کی۔

قرۃ العین حیدر کا گھریلو ماحول جاگیردارانہ ہوتے ہوئے بھی روشن خیال تھا جس کے سبب وہ نہایت ناز و نعم سے پلیں۔ان کے خاندان میں اسلامی روایات و اقدار کا پاس و لحاظ تھا جس کے سبب انہیں بھی اسلامی تعلیمات اور اقدار و روایات سے مکمل واقفیت بہم کرائی گئی اس امتزاج نے ان کے کردار کو ایک ایسے رنگ میں ڈھالا جس میں اپنی تہذیب و ثقافت اور تاریخ و روایت سے قلبی وابستگی کے ساتھ روشن خیالی کا انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے۔

قرۃ العین حیدر کے والد سید سجاد حیدر یلدرم کئی زبانوں کے عالم تھے گھر میں اخبارات و رسائل آتے تھے قرۃ العین ان میں شایع شدہ کہانیوں کو پڑھ پڑھ کر کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوئیں، پہلے بچوں کے اخبار پھول وغیرہ میں ان کی کہانیاں شایع ہوئیں ۱۹۴۴ء میں ان کا افسانہ ’ستاروں سے آگے‘ شایع ہوتے ہی لوگوں کی نظر میں آ گیا یہ وہ دور تھا جب تسلسل کے ساتھ ان کی کہانیاں منظر عام پر آنے لگی تھیں۔۴۶-۱۹۴۵ء کے درمیان رقص شرر، اے دوست، یوں ہی، اور یہ باتیں جیسی کہانیاں ساقی میں اور دوسرا کنارہ، سفینۂ غم دل اور جب پھول کھلتے ہیں وغیرہ افسانے دوسرے رسائل و جرائد میں منظر عام پر آئے تو سنجیدگی سے ان کے فن پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے اکہرے نہیں ہوتے، اگر ان میں ایک طرف انگریزی ماحول ہے تو دوسری جانب ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی بھی ہے۔انہوں نے جیسے جیسے شعوری پختگی کے مراحل طے کئے ویسے ویسے ان کے افسانوں میں تہذیب و ثقافت کے اثرات اور زیادہ گہرے اور بلیغ ہوتے گئے نیز فکری جوہر بھی نکھر کر سامنے آتا گیا ان کے افسانوی مجموعوں میں ستاروں سے آگے، شیشے کا گھر، پت جھڑ کی آواز اور روشنی کی رفتار سے سبھی واقف ہیں۔

۱۹۴۷ء میں وہ ناول نگاری کی جانب متوجہ ہوئیں اور آزادی کے بعد مکمل توجہ کے ساتھ انہوں نے ناول، ناولٹ وغیرہ تحریر کئے میرے بھی صنم خانے ان کا پہلا ناول تھا جس کے بعد سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم اور شاہراہ حریر وغیرہ منظر عام پر آئے انہوں نے نصف درجن سے زائد ناولٹ بھی تحریر کئے جن پر اس مقالے میں تبصرہ ممکن نہیں۔

قرۃ العین حیدر جدید اردو فکشن کی معتبر ترین آواز ہیں ان کے افسانوں میں اساطیر، تہذیبی روایات، عقائد، تاریخی واقعات اور کرداروں کی خوبصورت مرقع کشی موجود ہے، انہوں نے زمان و مکان کے روایتی تصورات سے حتی الامکان اپنے دامن کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے، ان کے ناول ہو ں یا افسانے دونوں میں جدید اسالیب بیان کی کارفرمائی بہت نمایاں ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے یہاں اتنا کچھ ہے کہ اس کے احاطے کے لئے مختصر مقالے ناکافی ہیں بقول پروفیسر وہاب اشرفی

'اجتماعی زندگی جیسی کہ کچھ ہمارے سامنے رہی ہے، ہمارا معاشرہ جن تبدیلیوں سے ہم کنار ہے، فسادات نے جو اثرات قائم کئے، وجودیت کے فلسفے نے جس طرح ذہن وفکر کو متاثر کیا ہے آزادی کے ابتدائی دور میں ہجرتوں کے سلسلے، جلاوطنیاں وغیرہ، ان کے علاوہ جڑ سے اکھڑتے ہوئے لوگ، تنہائی اور گمشدگی کا تصور، تاریخ کی کج کلاہٹ، مغرب اور مشرق کی ازلی کشمکش، قومیت اور بین الاقوامیت کے تنازعات اور پیچیدگیاں، جاگیردارانہ نظام کی ٹوٹتی پھوٹتی شکلیں، انسانی پریڈکمنٹ سبھی تو ان کے ناول کا قوام ہیں اس لئے قرۃ العین حیدر کے کینوس کو احاطۂ تحریر میں لانا آسان نہیں (۲)'

حقیقت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں کے ذریعے نہ صرف اردو فکشن کو عظمت و وقار سے آشنا کیا بلکہ تاریخ ادب میں خواتین ناول نگاروں کے وزن و وقار کو بھی استحکام و دوام عطا کیا اور تازہ ترین نسل کی ذہنی تربیت کا کارنامہ انجام دیا۔

خدیجہ مستور کا بچپن نہایت عسرت و تنگ دستی میں گزرا۔خدیجہ مستور نے گھر کے ادبی ماحول اور شوکت تھانوی کی تحریک پر ۱۹۴۲ء سے باضابطہ طور پر افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ان کی ابتدائی کہانیوں میں خیام اور عالم گیر میں طبع ہوئیں۔ظہیر بابر سے شادی کے بعد ان کے اقتصادی حالات بہتر ہو گئے اور انہوں نے پر اعتماد انداز میں افسانے کی طرف توجہ کی آزادی کے قریب ان کا ایک افسانہ ہند کے عنوان سے منظر عام پر آیا جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی بھی ہوئی۔خدیجہ مستور کے افسانوں میں زیادہ تر وہی مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں جن کا تعلق خواتین سے ہے خواتین پر جو مظالم و مصائب ڈھائے جاتے ہیں انہیں خدیجہ مستور نے ایک خاص زاویہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے عورت بالا دستی چاہنے کے ساتھ ساتھ گھریلو قید و بند کی زندگی سے آزادی چاہتی ہے خدیجہ نے خواتین کی اسی نفسیات کو ایک خاص انداز میں اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ہمارے بعض نقادان ادب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خدیجہ کے ابتدائی افسانوں پر عصمت کے اثرات موجود ہیں لیکن ان کے کسی بھی افسانے میں وہ بیباکی اور جنسی معاملات کا کھلا بیان موجود نہیں جس کے لئے عصمت جانی جاتی ہیں۔خدیجہ مستور کے یہاں سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کا انداز موجود ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ان کے افسانے عورت کی بے بسی اور بے کسی کے آئینہ دار ہیں۔

خدیجہ مستور یوں تو افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں معروف ہیں لیکن انہوں نے کچھ ناول بھی تحریر کئے ہیں جن میں آنگن کو خاصی شہرت ملی ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطابق آنگن امراؤجان سے زیادہ اہم ہے۔اس ناول کی ابتدا اس کی ہیروئن عالیہ کے شعور کی رو سے ہوتی ہے وہ کہانی کو آگے بڑھانے اور اس کی دلچسپی برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے وہ وقت سے پہلے بالغ اور باشعور ہو جاتی ہے اور یہی بات اس کی شکست کا سبب بن جاتی ہے ناول کا عنوان خاصا علامتی ہے اس لئے کہ ملکی اور قومی سطح پر جو جنگ لڑی جا رہی تھی وہ گھر سے باہر بھی لڑی جا رہی تھی اور گھر کے اندر بھی ایک ذہنی انقلاب کا معاملہ تھا جسے خدیجہ مستور نے محسوس کیا اور اپنے ناول آنگن میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا اسی وجہ سے فکشن کی دنیا میں انہیں اعتبار و استناد حاصل ہوا۔

بانو قدسیہ کا وطن فیروز پور پنجاب ہے ابتدائی تعلیم انہوں نے یہیں حاصل کی لیکن آزادی کے بعد ان کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا اور لاہور میں سکونت اختیار کی یہیں سے انہوں نے ۱۹۵۰ء میں اردو سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی ان کی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی۔ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے بازگشت، امربیل، کچھ اور نہیں اور سامان وجود وغیرہ منظر عام پر آ کر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ملکی اور عالمی حالات پر ان کی نظر بہت گہری ہے وہ انسانی ہمدردی کی افسانہ نگار ہیں اور اپنی کہانیوں کے ذریعے وہ ایسی فضا

کو عام کرنا چاہتی ہیں جس میں نسلی، علاقائی، مذہبی اور لسانی عصبیت کا کوئی وجود نہ ہو۔

۱۹۸۰ء کے بعد ان کے کئی ناول منظر عام پر آئے جن میں راجہ گدھ، ایک دن، شہر بے مثال اور موم کی گلیاں بے حد اہم ہیں راجہ گدھ کا پلاٹ سادہ ہے مگر ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہم آہنگ ہے گدھ ایک علامت ہے جو انسانی حرص وہوس کا استعارہ ہے گدھ مردار کھاتا ہے اور موجود دور میں انسان بھی اس قدر بے حس ہو گیا ہے کہ اسے حرام کی کمائی، رشوت خوری، فریب، دھوکہ اور مکاری میں کسی قسم کی کوئی برائی نظر نہیں آتی انسان کی اسی ذہنیت کو بانو قدسیہ نے اپنے ناول میں نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور کی چھوٹی بہن ہیں انہوں نے بھی اپنی ابتدائی زندگی اپنی بہن کی طرح عسرت وتنگ دستی میں بسر کی ۱۹۴۷ء میں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ لکھنو سے بمبئی آ گئیں اور پھر یہ خاندان پہلے کراچی اور بعد میں لاہور منتقل ہو گیا۔ ہاجرہ مسرور کے یہاں ترقی پسند تحریک کے اثرات بہت واضح ہیں۔ ان کی تحریروں میں جہاں انسانی ہمدردی کے پہلو موجود ہیں وہیں استحصال کے خلاف باغیانہ انداز بھی پایا جاتا ہے ان کے افسانوں کے مجموعے اندھیرے اجالے، کھیل اور ہائے اللہ وغیرہ ترقی پسند نظریات کے حامل ہیں جن میں انسان دوستی کے عناصر بہت نمایاں ہیں ہاجرہ مسرور کے یہاں سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کا نیا انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

سلمیٰ صدیقی اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار، ادیب ونقاد رشید احمد صدیقی کی دختر ہیں گھر کا ماحول ادبی تھا جس کے زیر اثر انہوں نے افسانہ نگاری کی جانب توجہ کی ترقی پسندوں سے متاثر تھیں اس لئے ان کے افسانوں میں مسلم گھرانوں کی استحصال سے متعلق باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں عورتوں کا استحصال، غربت، افلاس اور جاگیردارانہ نظام کی بدعنوانیوں سے ان کے افسانوں کا خمیر تیار ہوا ہے بھروسہ، مٹی کا چراغ، منگل سوتر اور عرش کا پایہ وغیرہ ان کی قابل ذکر کہانیاں ہیں زبان وبیان کی شگفتگی ان کے افسانوں کی امتیازی خوبی ہے۔

جیلانی بانو کا تعلق بدایوں سے ہے ان کے والد علامہ حیرت بدایونی نے بسلسلہ ملازمت حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے جیلانی بانو کی تعلیم وتربیت کے جملہ مراحل وہیں انجام پائے دوران تعلیم انہوں نے پہلے شعر گوئی کی طرف توجہ کی بعد میں افسانہ نگاری ان کی شناخت کا عنوان بنی۔ بیشتر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی گھر پر آمد ورفت کے سبب وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئیں جس کے نتیجے میں غریبوں مجبوروں اور پسماندہ لوگوں سے انہیں ہمدردی پیدا ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ موم کی مریم ادب لطیف میں شایع ہوا اس کے بعد ان کے افسانے سویرا، لاہور، افکار اور شاہراہ وغیرہ رسائل میں شایع ہوئے ان کے بعض افسانے تو بے حد اہم ہیں جن میں اسکوٹر والا، ستی ساوتری، نروان، آئینہ اور چابی کھو گئی وغیرہ۔

جیلانی بانو کے افسانوں میں عورتوں اور مردوں کی جنسی کج روی کا بیان بھی موجود ہے مگر ان کے اس طرح کے افسانوں میں تلذذ کی کیفیت نہیں ہے جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں ہندو مسلم فسادات کے پس منظر میں ہندو مسلم کرداروں کی ذہنی کیفیت کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ایوان غزل اور بارش سنگ کے ان کے قابل ذکر ناول ہیں۔ ایوان غزل میں حیدرآباد کے تہذیبی اور معاشرتی زوال اور انتہائی برق رفتاری سے تبدیل ہوتی ہوئی سماجی قدروں کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے اور مختلف نسلوں کے درمیان جو کشمکش دکھائی دیتی ہے اسے نمایاں کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

پاکستان کی خواتین افسانہ نگاروں میں خالدہ اصغر کا نام محتاج تعارف نہیں ۱۹۶۰ء کے آس پاس انہوں نے پہلا افسانہ دل دریا تحریر کیا جو ادب لطیف میں شایع ہوا تھا اس پر ناصر کاظمی نے ایک توصیفی نوٹ بھی تحریر کیا تھا جب ان کا افسانہ ایک بوند لہو کی منظر عام پر آیا تو انہیں مزید شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے جیسے پہچان، دروازہ اور مصروف عورت وغیرہ منظر عام پر آ چکے ہیں ان کے افسانوں میں تنہائی، محرومی

، بے بسی اور عدم تحفظ جیسے جدید عناصر کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

آمنہ ابوالحسن اردو کی مشہور افسانہ نگار ہیں ۱۹۵۰ء کے بعد وہ افسانے کے افق پر نمودار ہوئیں۔ان کے افسانوی مجموعوں میں کہانی، بائی فوکل، سیاہ سرخ سفید، اور تم کون ہو معروف ہیں آمنہ ابوالحسن کے کرداروں میں حقیقی زندگی کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے حیدرآباد کا ماحول اور وہاں کی زندگی اور آپسی تعلقات سے وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کرتی ہیں جس میں ان کا بیانیہ انداز مزید جان پیدا کرتا ہے۔

ذکیہ مشہدی کا آبائی وطن لکھنو ہے اور یہیں انہوں نے تعلیم وتربیت پائی کچھ عرصہ کانونٹ کالج لکھنو میں نفسیات کی استاد بھی رہیں بعد میں وہ پٹنہ چلی گئیں۔ پٹنہ میں پانچ چھ برس تک ایک بی ایڈ کالج میں درسی خدمات انجام دی۔انہیں اردو، ہندی اور انگریزی زبان پر یکساں قدرت حاصل ہے انہوں نے فروغ اردو کونسل کے لئے نفسیات سے متعلق کچھ کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے جدید ترین افسانہ نگاروں کی فہرست میں ان کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے ان کے افسانوں میں کمزوروں، دلتوں اور سماجی استحصال کے خلاف احتجاج کی لے موجود ہے اب تک ان کے ساٹھ سے زائد افسانے شایع ہو چکے ہیں۔ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو کرداروں کے ذریعے بیان کرتی ہیں جس میں زبان کی سلاست وسادگی لطف واثر کی کیفیت کو دوبالا کردیتی ہے اور قاری افسانہ نگار کے ساتھ ابتدا سے انتہا تک سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔

قمر جہاں اردو دنیا میں بحیثیت نقاد اور افسانہ نگار معروف ہیں چارہ گر اور اجنبی چہرے کے عنوان سے ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن کے مطالعے کے بعد بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی توجہ عموماً عورتوں کے مسائل پر مرکوز ہے۔جس میں زندگی کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کی مرقع کشی موجود ہے۔

کہکشاں انجم کے اب تک دو افسانوی مجموعے کہکشاں اور کرچیاں کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں ان کے افسانوں میں بھی عورتوں کے مسائل بیان ہوئے ہیں وہ عورتوں کے استحصال کے اسباب وعوامل کی تلاش وجستجو کرتے ہوئے باغیانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے صورت حال کو بدلنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔

نگار عظیم کے دو افسانوی مجموعے عکس اور گہن کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں جن میں سماجی رنگ بہت گہرا ہے۔ان کی نظر سماج میں پیدا ہو رہی نفرت وکدورت اور جبر واستحصال پر رہتی ہے اور انہی موضوعات سے ان کے افسانوں کا تانا بانا تیار ہوتا ہے انہیں کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کہنے کا ہنر آتا ہے۔جس سے ان کے افسانوں میں تاثر کی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں خالدہ حسین کو اس لحاظ سے انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں جدید رجحانات کو قبول کیا ہے مگر حقیقت نگاری کے اسلوب میں زیادہ توڑ پھوڑ کرنے کے بجائے دونوں کے امتزاج سے ایک متوازن صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی۔انہیں ابتداء ہی سے فرد کی داخلی کائنات سے دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے اپنے مجموعے معروف عورت میں نسوانی کرداروں کی نفسیات کو نئے انداز میں نہایت جرأت مندی کے ساتھ پیش کیا۔

حجاب امتیاز علی تاج نے رومان اور مزاح کے امتزاج سے اپنے افسانوں میں انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

آزادی کے بعد حقیقت پسندی کے نئے اسالیب کے زیر اثر ممتاز شیریں، الطاف فاطمہ وغیرہ نے بھی بہترین افسانے تحریر کئے ہیں ۱۹۸۰ء اور بعد کی دہائیوں میں جن خواتین نے افسانوی ادب میں اپنی شناخت بنائی ہے ان میں عطیہ سید، نیلوفر اقبال، نیلم احمد بشیر اور طاہرہ اقبال وغیرہ کے نام

خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔عطیہ سید نے جدید صنعتی اور تجارتی معاشرے میں افراد کے اشیاء اور بے معنی معروض میں ڈھل جانے کو موضوع بنایا ہے۔ان کے بیشتر کردار نسوانی ہیں وہ خواتین کی نفسیات کی خوبصورت عکاسی کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

نیلوفر اقبال کا رجحان حقیقت نگاری کی طرف ہے انہوں نے ڈھلتی عمر کی خواتین کی نفسیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔نیلم احمد بشیر کے افسانے بھی نسوانی نفسیات کی اچھی عکاسی کرتے ہیں گلابوں والی گلی اور اس کے بعد کے افسانوں میں ہمیں اوور ایج ہوتی عورت اور اس کے بچوں کے درمیان جذباتی تعامل کی خوبصورت ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں دیہاتی خواتین کے مسائل کو نہایت خوبصورت انداز میں اجاگر کرنے کی سعی نظر آتی ہے انہیں زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے اور کردار نگاری کا ہنر بھی انہیں آتا ہے اسی خوش سلیقگی کے سبب ان کے افسانے ابتذال سے پاک صاف دکھائی دیتے ہیں۔

بیسویں صدی میں خواتین نے اردو فکشن کی دنیا میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا مختصر جائزہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس میں بہت سے نام ابھی باقی ہیں جن تک اپنے محدود مطالعے اور وسائل کے کی بناء پر گفتگو نہیں کر سکا، لیکن اس مطالعہ کی روشنی میں اس نتیجہ تک ضرور پہنچا جاسکتا ہے کہ فکشن کے فروغ میں خواتین نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں اور کچھ پہلو تو ایسے بھی اجاگر کئے ہیں جن تک مردوں کی رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حوالے

(۱) رسالہ اردو حالی نمبر ۱۹۴۳ء کراچی ص ۱۰۲ بحوالہ ماہنامہ اردو دنیا اپریل ۲۰۰۱ء ص ۲۳

(۲) تاریخ ادب اردو جلد سوم وہاب اشرفی ص ۱۲۲۸، ۱۲۲۹

سر سیّد کا نظریۂ تعلیم

ڈاکٹر معین الدین شاہین
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
سمراٹ پرتھوی راج چوہان گورنمنٹ کالج، اجمیر (راجستھان)

سر سیّد احمد خاں ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے بذاتِ خود ابتدائی تعلیم کے بعد علومِ متداولہ کی تحصیل کی تھی تاہم آپ یہ چاہتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو دیگر اقوام کی طرح کامیابی وکامرانی حاصل کرنی ہے تو انہیں تربیت وتعلیم کے نور سے منوّر ہونا از حد ضروری ہے۔ آپ کا تعلیمی مشن مسلمانوں کو علوم وفنون سے وابستہ کرنے کے مقصود کو ملحوظ رکھ کر آگے بڑھا۔ سر سید اگرچہ مدرسوں کی تعلیم کے خلاف نہیں تھے، لیکن ان کا یہ نظریہ تھا کہ ہماری قوم دینیات کے ساتھ انگریزی زبان کے توسط سے سائنسی علوم وفنون سے بھی آراستہ وپیراستہ ہو۔ جامع تصورِ تعلیم کے مبلّغ ومفکر سر سید نے جگہ جگہ اپنے نظریۂ تعلیم کی وضاحت وصراحت مختلف حوالوں سے کی ہے۔ مدرسۃ العلوم جو بعد ازاں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے توسط سے مسلمانوں نے تعلیم وتربیت حاصل کر کے جو اعلیٰ وارفع مقامات حاصل کئے یہ سب سر سید کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ چونکہ سر سید کا تصورِ تعلیم از حد جامع اور وسیع تھا اس لئے آج بھی ماہرینِ تعلیم اُس کی پیروی پر مفتخر ہوتے ہیں۔

سر سید اپنے عہد کے مروجہ مشرقی طریقِ تعلیم میں تبدیلیاں چاہتے تھے آپ نے اکثر اپنی کتابوں اور ''تہذیب الاخلاق'' کے اکثر مشمولات میں مشرقی طرزِ تعلیم پر مغربی طریقِ تعلیم کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ انہیں اُس تعلیمی طریقے کی ضرورت تھی جو ہندوستانیوں کو صرف بابو، منشی یا کلرک تک محدود نہ رکھے۔ سر سید چاہتے تھے کہ ہماری قوم سے متعلق حضرات سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنی فتح وظفر کا پرچم لہرا کر اپنا اور اپنی قوم کا نام روشن کریں۔ سر سید کا تعلیم کے سلسلے میں یہ قابلِ قدر تصور تھا کہ مسلمان تعلیم کے لئے حکومت پر منحصر نہ رہیں کیونکہ حکومت کے لوگوں میں ہماری قوم کے تئیں نظریۂ تعصب گہرائی تک اُتر چکا ہے۔ آپ کا مشورہ تھا کہ مسلمان اس بابت خود کفیل ہو کر سائنسی اور صنعتی وحرفتی تعلیم کے میدان میں اپنا انفرادی مقام ثابت کریں۔

سر سید نے مسلمانوں کو تعلیمی پس ماندگی اور ابتری سے نکالنے کے لئے کس قدر کوشش، کاوش اور جانفشانی سے کام لیا اُس کے تذکروں سے کتابیں اور تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ علی گڑھ تحریک خالص تعلیمی اور تربیتی تحریک تھی جس میں سر سید اور اُن کے رفقاء اور ہم رکاب حضرات نے بھی شانہ بشانہ اپنی تمام تر قوت صرف کر کے بہترین نتائج حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔

سر سید یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمان خود اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور مختلف اداروں میں تسلیم شدہ نصابات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے اداروں کا تعلیمی نصاب خود مرتب کریں۔ دوسرے اداروں اور حکومت کے زیرِ اثر مرتب کردہ نصاب پر نہ تو اکتفا کریں اور نہ ہی اُسے قابلِ اعتماد تصور کریں۔ وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے پیشِ نظر مسلمانوں کے اداروں کا تعلیمی نصاب خوب سے خوب تر کی مثال ہو۔ اس سلسلے میں سہل انگار ہونے کے بجائے یہ نظریۂ کارفرما ہونا لازمی ہے کہ ہمیں اُن اقوام سے آگے نکلنا ہے جو اس وقت تعلیم وتربیت کے ذیل ہماری قوم سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔

۱۸۵۷ء کی شورش نے مسلمانوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اُن کے ٹوٹے ہوئے عزم و حوصلے کو تازہ اور برقرار رکھنے کی غرض سے سرسید نے تعلیمی مشن پر توجہ صرف کرنے کا مطالبہ مختلف طریقوں سے کیا۔ سرسید علم و عمل دونوں پر زور دیتے رہے اور حتی الامکان یہی کوشش کی کہ ہماری قوم کے حوصلے پست نہ ہوں۔ سرسید نے سنجیدگی اور غور و فکر کے بعد مسلمانوں سے رائے مشوروں کے دوران یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس قدر ہو سکے اپنے تعلیمی اداروں کے قیام پر توجہ صرف کریں تاہم علی گڑھ، مرادآباد اور غازی پور جیسے مقامات پر مدارس کا قیام عمل میں آیا۔

چونکہ سرسید نے انگلستان کے سفر کے دوران وہاں کی درس گاہوں کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں کے ماہرین تعلیم اور صحافی حضرات سے ملاقاتیں کر کے یہ معلومات حاصل کی تھی کہ انگلستان کے باشندگان تعلیم اور صحافت کو ترجیح دیتے ہیں تاہم ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اسی طرزِ عمل سے وابستہ ہونا چاہئے۔ واضح ہو کہ ۱۸۷۰ء میں آپ نے اسی غرض سے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا تاکہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کا رجحان عام ہو سکے۔ اس رسالے میں سرسید اور اُن کے ہم خیال و ہم رکاب حضرات نے جو تمثیلی مضامین تحریر کئے اُن کا براہِ راست مقصد صرف اور صرف اصلاحِ قوم و ملت رہا تھا۔ وہاں ادب تخلیق کرنا اُن حضرات کا منہاج نہیں تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ اُن حضرات نے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا تو بالواسطہ طور پر اردو کو بھی فائدہ پہنچا اور آج اُن کی تحریریں نہ چاہتے ہوئے بھی ادب کا حصہ بن گئی ہیں۔ خود سرسید نے خود کو ادیب کی حیثیت سے کبھی پیش نہیں کیا۔ لیکن اُن کے اسلوبِ نگارش نے انہیں ادیبوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

سرسید نے اپنے تعلیمی مشن کو تقویت بخشنے کی غرض سے ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی تھی اس بابت خواجہ الطاف حسین حالؔی رقم طراز ہیں :

''سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی گئی ہے کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر لکچر دیے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔'' (۱)

سرسید نے مذکورہ سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' نامی ایک اخبار جاری کیا جس میں بقولِ حالؔی سرسید کے اکثر مضامین سیاسی موضوعات پر ہوتے۔ ان مضامین میں تعلیم و فنون سے متعلق موضوعات بھی مضمر ہوا کرتے تھے۔ کتابی تعلیم سے متعلق سرسید کا یہ قول قابلِ غور ہے:

''اگر ہندوستان کو ہم کتابی تعلیم سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ اس طرح پر ہو کہ جس طرح ہم اس کو اپنی سلطنت یا قوانین سے فائدہ پہنچاتے ہیں یعنی ہم کو لازم ہے کہ اکثروں تک رسائی کر کے کتابی علم کو شائع کریں اور اس رکاوٹ سے جس میں وہ پڑا ہے اس کو آزاد کریں اور اس سے اپنا اصلی ارادہ اور مقصد یہ ٹھہرائیں کہ اُن مقصدوں مذکورہ بالا سے ہندوستانیوں کی حالت اصلی تبدیل ہو جائے۔ مناسب یہ ہے کہ علم کو ایسی شے ٹھہراؤ جس سے ہر روز فائدہ حاصل ہو اور اس کی تحصیل میں جہاں تک ممکن ہو آسانی ہو سکے۔ یہ سب میری خواہش ہیں اور اس لئے میں ملکی زبان کے ذریعۂ علم کو پہچاننے کے لئے حد سے زیادہ ترجیح دیتا ہوں کیونکہ وہ آسان ہے اور علم اس کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ وہ عملی طور پر بہت متاثر ہوتا ہے اور اس وسیلے سے علم کثرت سے پھیلتا ہے۔'' (۲)

واضح ہو کہ مذکورہ اقتباس میں سرسید نے صاف الفاظ میں یہ صراحت کی ہے کہ ملکی زبان کی بے حد اہمیت ہے اُن کے اس بیان سے اُن حضرات کے ان بیانات کی تردید ہوتی ہے جو سرسید پر مغرب زدگی کا الزام لگاتے ہیں۔

اسی سلسلے میں سرسید کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے :

''ارادہ ہے کہ اخبار میں نہایت عمدہ عمدہ مضامین جن کو بڑے بڑے قابل ہندوستان کے خیر خواہ انگریز اور قابل اور لائق ہندوستانی شرفاء لکھیں گے تا کہ عموماً ہندوستانیوں کی تعلیم بھی ہو اور لطف بھی حاصل ہو اور انگریزی زبان سے ترجمہ ہوکر نفیس اور عمدہ جو مضمون اب لکھے جاویں گے اور اخباروں سے ایسے مضمونوں کے ترجمہ چھاپے جاویں گے جو ہندوستانیوں بلکہ انسانوں کے لئے مفید اور کارآمد ہوں گے اور جن سے ہندوستان کے لوگ اور کسی طرح واقف نہیں ہو سکتے۔'' (۳)

یہاں سرسید نے اردو اور انگریزی کو یکساں طور پر تعلیم کے سلسلے میں اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ سرسید کا نظریۂ تعلیم بہت واضح تھا وہ کبھی گمراہ کن مشورے اور تجاویز پیش نہیں کرتے تھے بعض اصحاب نے سرسید پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں کے مخالف تھے۔ ایسے حضرات نے اکثر یہ لکھا ہے کہ سرسید چاہتے تھے کہ لڑکیاں صرف دینی تعلیم حاصل کریں، پردے کا اہتمام کریں اور محض امور خانہ داری پر اپنی توجہ صرف کریں۔ اس بابت اکثر حضرات سرسید کے اس قول کو نقل کرتے ہیں:

''عورتوں کی تعلیم نیک اخلاق، نیک خصلت، خانہ داری کے امور، بزرگوں کا ادب، خاوند کی محبت، بچوں کی پرورش، مذہب کی معلومات ہونی چاہیئے، اُس کا میں حامی ہوں، اس کے سوا اور کسی تعلیم سے بیزار ہوں۔'' (۴)

سرسید کا ایک اور قول موضوعِ بحث رہتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

''خدا کی برکت زمین سے نہیں آتی بلکہ آسمان سے اترتی ہے، سورج کی روشنی بھی نیچے سے نہیں آتی بلکہ اوپر سے آتی ہے، اسی طرح مردوں کی تعلیم سے عورتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔'' (۵)

واضح ہو کہ بعض معترضین سرسید کے اصل مقصد سے نابلد تھے۔ سرسید دراصل سب سے پہلے مردوں کی تعلیم کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے، تا کہ مسلمانوں میں تعلیمی ماحول پیدا ہو جائے۔ اس ماحول کو بنانے میں ہی انہیں طرح طرح کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور اگر ایسے میں وہ تعلیمِ نسواں کی بات کرتے تو ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی وہ موقع و محل کی مناسبت سے تعلیمِ نسواں کی بات بھی بڑے سلیقے سے کہا کرتے تھے، یعنی :

''اس میں کچھ شک نہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے عام اسکول کے بنانے کو جہاں کہ عام لڑکیاں بلا لحاظ اس کے کہ کس قوم و خاندان کی ہیں، چادر یا برقعہ اوڑھ کر یا ڈولی میں بٹھا کر بھیجی جاویں، میں پسند نہیں کرتا۔'' (۶)

واضح ہو کہ یہاں سرسید نے لڑکیوں کی تعلیم پر اعتراض نہیں کیا صرف تعلیمی اداروں تک رسائی کے طریقوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سرسید کے ایک اور قول پر بھی بعض لوگوں کو سخت اعتراض ہے:

''یہی تعلیم اُن کے دین اور دنیا دونوں کی بھلائی کے لئے کافی تھی اور اب بھی یہی تعلیم کافی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو افریقہ اور امریکہ کا جغرافیہ سکھانے اور الجبرا کے قواعد بتانے اور احمد شاہ اور محمد شاہ اور مرہٹوں اور دہلویوں کے قصے پڑھانے سے کیا نتیجہ ہے۔'' (۷)

راقم الحروف کا یہ نظریہ ہے کہ معترضین دراصل سرسید کے اصل مقصد کو نہیں سمجھ پائے۔ سرسید ہندوستانی مسلمانوں کو سب سے قبل اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو مدرسہ بھیجنا تو شروع کریں اور بعد ازاں جب ماحول تیار ہو جائے گا تو مذکورہ علوم و فنون میں از خود اُن کی دلچسپی بڑھنے لگے گی۔ لہٰذا اگر سرسید کے مذکورہ بیان کو توڑ مروڑ کر اعتراض کیا جائے تو اُسے محض اعتراض برائے اعتراض ہی سمجھنا چاہئے۔

بعض اصحاب نے سرسید پر یہ الزام تراشی بھی کی ہے کہ وہ صنعت پیشہ اور پس ماندہ طبقے یا ذات برادری سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی

تعلیم وتربیت کی حمایت نہیں کرتے تھے، اُن کا یہ نظریہ تھا کہ صرف اعلیٰ ذات برادری اور طبقے سے متعلق مسلمان ہی تعلیم حاصل کریں اور صنعت وحرفت سے وابستہ لوگ صرف اپنے آباء واجداد کے پیشے اور کام کاج میں دلچسپی رکھیں۔ اگر اس الزام کو بالفرض مان لیا جائے تو سرسید کا یہ نظریہ ''منوسمرتی'' (Manu Smruti) کے دوش بدوش تھا۔لیکن راقم الحروف اس اعتراض کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ محض سرسید کی کردار کُشی کی کوشش ہے۔ سرسید قوم کو تقسیم کرنے کے بجائے یک جہتی اور مساوات کی بات کرتے تھے وہ مسلمانوں کو ایک اکائی مانتے تھے اور ہمیشہ اے میرے قومی بھائیو !! جیسے جملوں سے مخاطب کرتے تھے اس سلسلے میں موصوف کی بہت سی تحریریں گواہ ہیں۔ سرسید کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ کر قومی بہبود اور ترقی کے لئے کوشش کریں، اس لئے یہ الزام قابلِ قبول نہیں کہ سرسید اونچ نیچ یا ادنیٰ واعلیٰ کا تصور رکھتے تھے۔ سرسید ہر قسم کے تعصب سے اوپر اُٹھ کر اپنی بات کہتے تھے۔ اور جو شخص خالص اسلامی طرزِ عمل پر زندگی بسر کرنے پر زور دیتا ہو وہ اونچ نیچ، ذات برادری کی بات کیسے کرسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی الزام تراشی کی تردید خود سرسید کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے:

''اے عزیزو ! اگر تعلیم کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس تعلیم سے قوم قوم نہ بنے وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں۔ پس انگریزی پڑھ لینا اور بی-اے، ایم-اے ہو جانا جب تک اُس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فیلنگ نہ ہو تو قوم کو قوم اور ایک معزز قوم نہیں بنا سکتے۔ اسلام نے اس قومیت کے بدلے جو نسل یا ملک کے سبب گنی جاتی تھی اسلامی قومیت قائم کی ہے جس نے کلمہ پڑھا خواہ وہ چین کا ہو یا جاپان کا، عرب کا رہنے والا ہو یا ہندوستان کا، سب آپس میں بھائی بھائی اور مسلمان ہیں اور ایک قوم اسلام۔''(۸)

دراصل سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان تعصب اور گروہ بندی میں الجھ گئے تو تمام تر ایسے کام التوا میں پڑے رہ جائیں گے جن سے قومی ترقی بھی متاثر ہوکر رہ جائے گی انہوں نے اس بابت یہ تحریر فرمایا کہ :

''مسلمانوں پر واجب ہے کہ تعصب کو چھوڑ دیں اور بعد تحقیقات اور مباحث کے سلسلۂ تعلیم مسلمانوں کا ایسا قائم کریں جو اُن کے دین اور دنیا دونوں کے لئے مفید ہو۔''(۹)

سرسید نے مذکورہ اقتباس میں مذہبی وقومی یک جہتی اور تعلیم کے افادی پہلوؤں پر کارآمد تجاویز پیش کی ہیں جو انسان کی ذہنی سطح کو بلندی عطا کرنے میں معاونت کرتی ہیں۔ سرسید نے درحقیقت مسلمانوں سے اُس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی علوم وفنون سے وابستگی کا مطالبہ کیا تھا جب ہمارے علمائے دین اور قائدینِ ملّت اس قسم کی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے سمِ قاتل متصور کرتے تھے اور کہیں نہ کہیں یہ بھی محسوس کرتے تھے گویا سرسید اُنہیں مذہب اور تہذیبی روایتوں سے دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں جب کہ سرسید کا ذہن ودل ہر طرح کی کدورت سے پاک صاف تھا۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی ذہنی کشمکش کو بھانپ لیا تو یہ فرمایا کہ:

''مسلمانوں کو بھی یہ چاہئے کہ وہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ وہ فصاحت وبلاغت میں سمٹک زبانوں میں لاثانی ہے۔

اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش ہماری بہتری، ہماری زندگی یا آرام بسر کرنے کے ذریعے بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرح بہت توجہ کرنی چاہئے۔''(۱۰)

جب ہندوستانی مسلمانوں نے سرسید کے نظریاتِ تعلیم پر یک سوئی سے غور وفکر کیا تو وہ آہستہ آہستہ اور بعد ازاں برق رفتار انگریزی تعلیم اور

مغربی علوم سے وابستہ ہونے لگے۔ ہم آج جس قدر بھی ترقی کر رہے ہیں اس کے پس پشت سرسید کا وہی نظریۂ تعلیم کارفرما ہے جسے ہمارے بزرگوں نے سرسید کی آواز پر لبیک کہہ کر اُن کی نیک نیتی کی تائید کی تھی۔ سرسید وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ہمیں قومی تعلیم کے تصور سے روشناس کرایا۔ چنانچہ وہ حضرات جو ابتداءً سرسید کے مشن اور مقصد و منہاج کو سمجھے بغیر مخالفتوں اور اعتراضات کی جھڑی لگا دیتے تھے، اب سرسید کے ہم نوا اور ہم رکاب ہونے پر مفتخر ہونے لگے۔ اپنے تعلیمی مشن اور تحریک کے سبب سرسید اور اُن کے رفقاء ہمیشہ تعظیم و تکریم کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

حوالے:

(۱) ''مطالعۂ سرسید احمد خاں''، مولوی عبدالحق، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۷ء، ص ۳۵

(۲) ''روئداد سائنٹفک سوسائٹی''، نمبر ۱۰

(۳) ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ''، جلد ۱، شمارہ ۱، بابت ۳۰/ مارچ ۱۸۶۶ء

(۴) ''خطباتِ سرسید''، جلد دوئم، ص ۲۸۰، ۲۷۹

(۵) ''خطباتِ سرسید، جلد دوم، ص ۲۲۴

(۶) ''ایضاً'' ص ۲۷۹

(۷) ''ایضاً'' ص ۸۰، ۲۷۹

(۸) ''خطباتِ سرسید''، جلد دوئم، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، ص ۶۱، ۳۶۰

(۹) ''مقالاتِ سرسید''، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، حصہ ہفتم ۱۹۶۳ء، ص ۱۵

(۱۰) سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ سراج الدین ۱۸۹۰ء، ص ۱۸۴

سیف و قلم ٹونک

صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خان
ڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک

تو نک آن بزمِ خوش کلامان
خوش نگاہان و گل بدامانان
شعر و افسانہ را روایت ہا
نقد و تحقیق را درایت ہا
سقف و محرابِ زر نگار این جا
ہست افسانۂ بہار اینجا
چہ قدر نقش دل نشینی است
ہمچو فردوس بر زمینی است
حرفِ شیرین ز علم و فن اینجا
صد چراغی ز انجمن اینجا
ہم چون شہری خجستہ آئینی
صد کتاب و ورق بہ تزئینی
صفحی ہا ہمچون نور ایمانی
نقش ہا چون حدیث و قرآنی
حکمت و شعر را خزینہ درو
قدر و معیار را سفینہ درو
چون سرای ز حسن انجمنی
تا بہ ایران می رود سخنی

ٹونک ان بہادروں اور سورماؤں کا شہر ہے جو نہ صرف اپنی سیف سے بلکہ قلم سے بھی فتح مندی کا اعلان کر چکا ہے۔ یہاں نہ صرف بہادر اور سورماؤں نے پناہ لی بلکہ علماء، فضلاء، حکماء، ادباء، شعراء اور فقہاء بھی آباد ہوئے۔ یہاں کی سرزمین رود بناس کی شیرینی کی طرح شیریں، پاک و صاف، امن و امان کا گہوارہ اور علم و ادب کا مرکز ہے

سولنکیوں سے لے کر علاء الدین، حضرت امیر خسروؔ کا گذر ہوا۔ نیز رضیہ سلطانہ اور یعقوب نے بھی کچھ مدت تک یہاں قیام کیا اور پھر آخر کار ٹونک ۱۸۰۶ء میں نواب امیر خاں کے زیر اقتدار آیا۔ جسونت راؤ ہلکر سے باہمی رضامندی کے بعد سرونج، پڑاوہ، نیماہیڑہ، جھبڑہ اور ٹونک آپ کے

قبضہ میں رہااور پھر ۱۸۱۷ء میں انگریزوں نے معاہدہ کے بعد علی گڑھ کواور بڑھا کر پیش کش کی جس کے نتیجے میں ایک مسلم مضبوط ریاست وجود میں آئی۔

یہ راجپوت سورماؤں کی سرزمین راجستھان نے ایک اور پٹھان سورما کواپنی سرزمین میں پناہ دی اور یہ ایسا مضبوط سپاہی تھا جوتمام ہندوستان کواپنی تلوار کے بل پر قبضہ میں کرنا چاہتا تھااورانگریزوں کو یہاں سے نکال کر باہر کرنا چاہتا تھا جوایک پرامن اورگنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کا حامل تھا۔جب یہ انگریزوں نےمحسوس کیا توامیر خاں سے خائف رہنے لگےاور چاہتے تھے کہ امیر خاں سے معاہدہ کریں چنان چہ انگریزوں نے ماحول بنانا شروع کیااوراس سلسلے میں امیر خاں کوان کے کچھ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اب آپ کی عمر کا تقاضہ یہ ہے کہ انگریزوں سے سندھی کرلی جائے اورادھر جسونت راؤہلکر نے انگریزوں سے سندھی کرلی تھی توان باتوں کے پیش نظر میر منشی وکیل لالہ نرنجن رائے کوسندھی کے لئے پہنچایااور معاہدہ کیا۔۱۶؍نومبر ۱۸۱۷ء میں اس طرح ٹونک ریاست کی تشکیل ہوئی اورشروع میں نواب امیر خاں بہادر کو پندرہ توپوں کی سلامی کی اجازت رہی جو بعد میں بڑھ کر ۱۷توپوں کی سلامی ہوگئی اورآخرتک یہ دستور جاری رہا۔

انگریزوں سے سندھی کرنے کے بعد نواب صاحب کا توپ خانہ جودنیا کا سب سے بڑا توپ خانہ تھاوہ آدھارہ گیامگراب بھی یہ توپ خانہ اور سلاح خانہ ٹونگ کی آن بان اور شان تھا۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب مہارانی وکٹوریہ کی تاک پوشی ہوئی تو ہندوستان کی تمام ریاستوں کے توپ خانے منگواکر سلامی دی گئی،اس موقع پرٹونک کا توپ خانہ طلائی تمغہ کے ساتھ اول مقام پر فائز ہوا۔یہاں کا توپ خانہ کافی معروف ومشہور تھا،اتنی بڑی بڑی توپیں تھیں کہ درزی بیٹھ کر سلائی کرلیا کرتا تھا۔ان توپوں کے نام مولیٰ بخش،الٰہی بخش،وزیر بخش اورامیرا توپ تھے۔امیرا توپوں کی مار اتنی تھی کہ غنیم کی چڑھائی کے وقت ان توپوں کی مدد سے دونوں قلعوں کی حفاظت کی جاسکتی تھی۔مذکورہ توپوں کے پاس حوض بنے ہوئے تھے،توپچی توپ کوداغ کرفوراً ان حوضوں میں کودجاتے تھےاگرایسانہیں کرتے تو کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔

ملک محمد دین مصنف 'جشن مسند نشینی نواب سعادت علی خاں' ص۱۰ پر رقم طراز ہیں 'توپیں مگردہن میں جن کی شکل مگرمچھ کی سی ہےان پر کتبہ جات بھی کندہ ہیں۔توپوں پرنواب امیرالدولہ بہادر کے جنرل محمود خاں مختارالدولہ ثابت جنگ کے نام کندہ ہیں'۔

ریاست ٹونک میں دوطرح کی توپیں تھیں ایک توقلعوں اورمحلات پرنصب کرائی گئیں اوردوسری توپیں عیدمیلادالنبی اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت ایک سوایک توپیں چلتی تھیں اوراس طرح رمضان کا چاند،عید کا چاند، روزہ کشائی اورسحری کے وقت توپوں کے چلنے کا انتظام تھا۔عیدیں یعنی عیدالفطراورعیدالاضحیٰ پرنواب کے نہاتے وقت اور روانگی کے وقت اور بعدنماز بدستورتوپیں چلتی تھیں،اسی طرح سلاح خانے میں بہت ساری تلواریں،بندوقیں،خنجرمحفوظ تھے،یہاں میں کچھ خاص تلواروں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔وکرمادتیہ کی تلوار بھی موجودتھی،خاص کرمشہور تلوار حسینی تلوار تھی جس کا اعجاز یہ تھا کہ یہ تلوار سب تلواروں کے نیچے بکس میں رکھ دی جائے تو دوسرے دن وہ خودبخود سب تلواروں سے اوپر ہوتی تھی۔یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تلوارامام حسین کے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کی تلوارتھی۔کالے پہاڑ کی جوڑاتلوارتھی،نواب امیر خاں صاحب کے یہاں تلواریں اورتوپیں اعلیٰ معیار کی محفوظ تھیں۔ایک مشہورواقعہ ہے کہ جب ایک گھوڑا بے لگام اورمست ہوگیا تھااورکسی کے بھی قابو میں نہیں آرہا تھا تب نواب امیر خاں چھپ کرقلعہ میں ایک جگہ کھڑے ہوگئے اور جب گھوڑا آیا تو ایک ہی وار سے اس کوختم کردیا۔کہا جاتا ہے کہ یہ انہی تلواروں میں سے ایک تلوارتھی۔اسی طرح پونہ کی مشہور و معروف تلوارتھی۔جب پونہ میں جسونت راؤہلکراورنواب صاحب نےمل کرفتح حاصل کی تو جسونت راؤہلکر نے مال غنیمت سونا چاندی ہیرے جواہرات ایک طرف رکھےاوردوسری طرف اسی مال غنیمت میں جیتی ہوئی تلواررکھی اورامیر خاں سے کہا کہ نواب اس میں سے ایک چیز لےلو۔دلیراورمجاہدآزادی

کالا واجن کے دل میں دھڑک رہا تھا اس نے جلدی آگے بڑھ کر تلوار اٹھالی اور کہا کہ اگر یہ میرے پاس ہے تو میں اس جیسے کئی خزانے حاصل کرلوں گا ۔بہادر شاعر کہتا ہے

سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ اک تلوار پر
بخش ڈالے گنج پونہ کے سبھی لعل و گہر
جب جگت سنگھ عہد و پیماں سے گیا یک دم مکر
پھر اشارے میں کیا جے پور کو زیر و زبر
بہن بن کر جب مہارانی سوالی بن گئی
اس کو پھر جے پور کی واپس ریاست بخش دی

پرنسیپ کے مطابق نواب امیر خاں کے جسم پر ۳۲ گھاؤ تھے ۔یہ بہادر نبرد آزما وہ شخص ہے جس نے کبھی ہار کا منھ نہیں دیکھا جس جنگ میں وہ گئے فتح یابی ان کی قسمت بن گئی۔

وہ امیر الدولہ ممکن تھی نہ جن کی ہمسری
تیغ سے جن کے مقابل کو نہ ملتی جانبری
شوکت و اجلال میں تھا آفتاب خاوری
تاج داروں میں تھا زیبا جس پہ تاج سروری
کوئی بھی مد مقابل ہند میں اس کا نہ تھا
تھا وہ طوفان شجاعت چڑھ کے جو اترا نہ تھا

ٹونک ریاست ملنے کے بعد ایک تاریخ نگار نے گورنر جنرل بینٹینگ سے یہ سوال کیا کہ آپ نے امیر خاں سے سندھی کیوں کر لی تو گورنر جنرل کا جواب تھا کہ ہم نے ایک کھلے شیر کو ریاست سونپ کر پنجرے میں قید کرلیا۔

ایک متبرک خنجر سید احمد شہید نے نواب وزیرالدولہ کو عنایت کیا تھا جس کو تیغہ کے نام سے جانا جاتا ہے وہ بھی سلاح خانے کی زینت تھا

اب تو کیا ہے حسرتوں کا جھلملاتا سا چراغ
ایک منظر تھا کبھی اپنے دل ناشاد کا

اسی طرح ٹونک کے سلاح خانے میں محفوظ اسلحہ کی ایک بڑی طویل فہرست ہے مگر نوک شمشیر سے بھی خطرناک نوک قلم ہے ۔تلوار کا وار خالی جا سکتا ہے مگر قلم کا وار خالی نہیں جاتا ہے ۔وہ نتیجہ بر آمد کرتا ہے ۔ریاست ٹونک کے نواب تلوار اور قلم دونوں کے دھنی اور علم دوست ،علماء اور ادباء نواز تھے ۔

ٹونک امیر خاں کے زمانے سے ہی علم وادب کا ملجا و ماویٰ تھا ۔نوابین نے ادب ہو،تہذیب وتمدن ہو،قومی یک جہتی ہو،گنگا جمنی تہذیب ہو ،سب کی آبیاری کی اور ہر فن اور فنکار کی سرپرستی بھی کی ،یہی وجہ ہے کہ ٹونک کے امیر یہ خاندان اور صاحبزادگان اور تقریباً ٹونک کے ہر فرد کے گھر میں کتب خانے موجود تھے ۔علماء،شعراء،ادباء اور فقہاء یہاں لعل و جواہر کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور تشنگان علوم ملک اور بیرون ملک سے آ کر اپنی پیاس

کو یہاں بجھاتے تھے۔بعض تو یہاں رہ گئے اور بعض دنیا میں مختلف جگہوں پر منتقل ہو گئے۔علامہ اقبال نے بھی علمی وادبی موتیوں کا ذکر اور یہاں سے کتابوں کا یوروپ جانا اپنے ایک شعر میں اس طرح نظم کیا ہے کہ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

سرزمین ٹونک میں جگہ جگہ کتب خانے تو اب نہ رہے لیکن ایک کتب خانہ جواب تمام عالم میں مشہور ومعروف ہے وہ قصر علم مولانا ابوالکلام آزادعربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے موسوم ہے۔ریاست ٹونک تو ختم ہوگئی لیکن یہ کتابوں اور تاریخ ٹونک کی ریاست آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔بقول مسدس آئینۂ ٹونک مصنفہ صادق بہارؔ

جہد شوکت سے ہوا ہے یہ ٹونک پھر سے باوقار
ہے یہ اقلیم علوم شرقیہ کا تاج دار
وہ ہیں اسناد و فرامین و کتب مژدہ ہزار
جس کا تھا کم یابی و نا یابی میں اب تک شمار
شش جہت میں ہو رہی ہے اس کتب خانے کی دھوم
اک اجڑا شہر دوبارہ ہوا شہر العلوم

☆

ہر نظر میں کِرم خوردہ جو کتب کا ڈھیر تھا
ڈھیر بھی ایسا کہ جو سمجھا گیا بے کار سا
مرحبا شوکت علی خاں تیری محنت مرحبا
تو نے تحقیقی ادارہ کا اسے رتبہ دیا
نیشنل ایوارڈ تیرے حسن خدمت کی دلیل
منزل راہ ترقی کا ہے پہلا سنگ میل

☆

مرکز علم و ذکاوت مصدر صدق و صفا
پیکر روحِ شرافت مظہرِ حق آشنا
سرمۂ اہلِ بصیرت خوگرِ مہر و وفا
غیر ممکن ہے بیاں کرنا ترے اوصاف کا
تیرے قصرِ علم سے شوکت ہے شوکت ٹونک کی
تیرے دم سے بڑھ گئی دنیا میں عظمت ٹونک کی

☆

ملت بیضا ترا یہ قیمتی سرمایہ ہے
خود یمین الدولہ، جس کے واسطے ساعی بنے
موتیوں کے مول میں نایاب مخطوطے لئے
اور اشاعت کے لئے شعبے الگ قائم کئے
تب ہوا یہ کتب خانہ کہیں جلوہ پذیر
اس کے مخطوطوں کی دنیا میں نہیں کوئی نظیر

☆

ہند کا پیرس گلابی شہر گر جے پور ہے
گڑھ میں گڑھ چتوڑ گڑھ ہے جس پہ وہ مغرور ہے
برق چنبل ڈیم سے کوٹہ اگر پر نور ہے
روضۂ خواجہ سے ہاں اجمیر بھی مشہور ہے
شمع کو ہے جس طرح جاں سوز پروانوں پہ ناز
ٹونک کو ہے اس طرح اپنے کتب خانوں پہ ناز

☆☆☆☆☆

سروج سرونج کے گل سرسبد ناطق سرمد

صاحبزادہ شوکت علی خان

فاؤنڈر رڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک

’سہ روزہ‘ شاہ افروز سرونج ایک تاریخی، علمی اور ادبی شہر شاہ بخت وملک تخت رہا ہے جو ایک طرف اگر شاہ سہسرام شیر شاہ سوری کا مامن ومسکن رہا ہے۔ وہاں حضرت مجنوں شہید کا آباد کردہ شہر شہیر رہا ہے جہاں اکبری سالار ذیشان بیرم بیگ کا پائگاہ رہا ہے وہاں قاضی القضاۃ عبد الہادی کا دار الامارت بھی رہا ہے جہاں عالم گیر شاہ اورنگ زیب کا عالمگیر نشان اورنگ زیب رہا ہے وہاں نواب امیر الدولہ کا فوجی قصبہ اور تحریک آزادی کا پہلا پایۂ تخت امیری ووزیری بھی رہا ہے جہاں شاہ زور روہیلی پٹھانوں کا فیروز بخت محور ومنظر رہا ہے وہاں مغل امراء ووزراء کا مقام صالح انصرام بھی رہا ہے جہاں فقراء واحرار وابرار زہاد وعباد واوتاد وقطاب اور اصحاب فکر ونظر کا مرجع رہا ہے وہاں شعراء ادبا اور علماء وفضلا عظام کا مستقر بھی رہا ہے اس کی مقدس بارگاہ میں اب بھی عظیم المرتبت اور عزیز المنز لت اولیاء اور اتقیاء آرامیدہ ہیں۔

سرونج مقام سہ روزہ مقام شیر شاہی نظام خانقاہی اور عالمگیری جلالت پناہی و پادشاہی ونہاد شہی وشاہی ہو کہ نہ ہو میری نظر گرہ گیر میں سرونج ایران کے شہر شہیر سروج سے مشتق ومشقّق نظر آتا ہے جو علامۃ الدھر حریری اور حضرت ابوسعید کا ملجا وماویٰ ہے تو سرونج سرمایۂ مالوہ جو امتداد زمانہ اور عہد در عہد ورفتگی وپیش رفتگی کے ساتھ سروج سے سرونج ہو گیا جس کے حرف ژروف عبارت ہیں سیادت وریاست ووجاہت وصیانت، نقش قدوم میمنت لزوم ونطق ونظافت وجمال وجلال وسیادت ووجاہت وجلال وجمال کا محور ومنظر ایک تاریخی شہر پناہ اور عالمگیری پائگاہ کمال وافضال رہا ہے جہاں سے رام وسیتا گزرے ہیں۔ سرون کمار اور کالی داس رہے بسے ہیں۔ عالم پناہ عالمگیری رایات ظفر آیات کا جہاں باب فتح یاب رہا ہے وہاں شیر شاہ سوری کا شیر شاہی شہر شہیر بھی رہا ہے اور امیری صولت وشوکت کا امیر نشاں امارت جاہ پناہ بھی رہا ہے یہیں سے نواب امیر خاں مجاہد وغازی کو سروری وتاج وری اور کشور گیری ملی ہے۔ یہ شہر سروراں وشایگاں وشاہوران وسرخیلان وسراندازان ودلاوران اور ماہ وشان کا شہر نگاراں ہے یہ عالمیان اعلام وجانان جہانیاں کا ملجاؤ ماویٰ اور شعراء نکتہ پردازان وسخنورانِ جادو سامان کا مستقر اور نکتہ وران جہان وجہانیاں اور عذوبت بیان پاسدارانِ عالم وعالمیان کا شارستان ونگارستان ہے ان ہی پاس داران ادب اور راہ نوردان علم وفن میں ایک سخن وراشعر واشہر شہریار منظومات ومنطوقات ناطق عاتق بھی اس فہرست زرنگار میں عروۃ الوثقیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے دلی میں میر وغالب، ناسخ وآتش ہوئے ہیں اسی طرح سرونج میں مرمت خاں مرمتؔ، شرقؔ (۱) گویاؔ (۲) رقمؔ دہلوی، نکہتؔ دلی کی آبرو بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظر اس لئے آتے ہیں کہ وہ دلی کی نظر گرہ گیر کے اسیر سریرا اور میرؔ ودبیرؔ ونظیرؔ کے پابہ زنجیر اسیر فرہنگِ حریر وظہیر تھے

میں تو فخر محسوس کرتا ہوں کہ محبّ مکرم شوکت نواز جناب شاہد میر جو خود میر منیر اگر نہیں تو ثانی میر ضرور ہیں، نے اپنے نانا جان جناب ناطق مرحوم کے کلام بلاغت نظام ’سخن معتبر‘ اور سخن ور منتوّر ومقتدر پر خامہ فرسائی کے لئے مجھ ہیچ مداں فقیر حقیر عاصی پر معاصی کو منتخب کیا۔ ’سخن معتبر‘ تو ان کا کلام مختصر ہے ہی لیکن وہ تو خود ہی سراپا سخن معتبر ومعنبر ہیں۔ میں نے جناب ناطق کا کلام فصاحت ارقام کی خواہش کی۔ جناب شاہد میر کے حبیب لبیب میرے برادر عزیز وغریز محبّ مکرم جناب مرزا فصیح اللہ بیگ صاحب نے نہ صرف ارسال کیا بلکہ جب مجھے لکھنے میں دیر ہوئی تو سرونج سے خود بہ نفس نفیس ٹونک وارد

ہو گئے۔ میں نے بہت انہاک استمساک سے مطالعہ کرنا شروع کیا یقین کیجئے ہر غزل کے ایک دو شعر پر بے ساختہ دل دادہ داد نکلتی تھی ’ارے شاعر ہے ارے شاعر ہے‘ کبھی آواز محکمہ سے کہتا تھا ارے میرؔ، غالبؔ کے رنگ وآہنگ کے شعر ہیں کیا تغزل کیا تجمّل کیا تخیّل کیا فلسفۂ شعریت کیا علو بیانی کیا گہرائی کیا گیرائی کیا محاکاتی شان کیا زبان وبیان کا اہتمام والتزام بے بایاں تخیل کی پہنائیوں کو ردیف وقوافی میں منضبط کر دینا جیسے یہ الفاظ اسی کے لئے ہوں اور خیال بھی اان ہی الفاظ کے لئے تخلیق کیا ہو۔ خیال کو الفاظ ومعنی میں پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ شیلے نے کہا تھا کہ ’خیال اس شعلۂ نو آفریدہ کے مانند ہے جو دمگاہ سے نکالتے ہی خاکستر آلود ہو کر اصلیت کھو دیتا ہے‘ (۳) اصلی خیال کو الفاظ ومعنی میں وضع کرنا ناممکنات سے ہے لیکن ناطقؔ صاحب نے اس خیال کو ممکن بنا دیا ہے وہ خود فرماتے ہیں

یہ شوخیِ بیاں یہ بیان رموزِ عشق
ناطقؔ تمہارا دل بھی کہیں مبتلا تو ہے

لیکن تعلّی کے ساتھ اپنی قسمت پہ شاکر وصابر رہتے ہیں حالانکہ وہ اپنے دور کے شعراء میں وہ کسی سے کم نظر نہیں آتے

بظاہر ہم بھی اپنے دور میں کچھ کم نہیں ناطقؔ
مگر مقسوم میں جس کے قبول عام آ جائے
میرؔ و غالبؔ پر ہی اے ناطقؔ نہیں کچھ منحصر
جس پہ نظریں ڈال دیں اس نے غزل خواں ہو گیا

میں نے طالب علمی کے زمانے میں ایک غزل کسی کے سحر آفریں ترنم میں سنی تھی مطلع نے ہی دل کو دلِ بیدم اور دم بیدم کو دم بدم دلگیر ودل گرفتہ کر دیا

کچھ روز شاد ہولے اے گردش زمانہ
مٹ جائے گا نشیمن رہ جائے گا فسانہ

پھر حسن مطلع نے تو قیامت سے پہلے قیامت برپا کر دی

سنتے ہیں بجلیوں نے گلشن کو پھونک ڈالا
کیا ہم نشیں یہ سچ ہے اف میر آشیانہ

کتنے وسیع وعریض اور قیامت خیز خیال کو جو بمنزلۂ ایک روداد جانکاہ وجاں گسل ہے کس مسحور کن اور مسخرانہ انداز سے دو مصرعوں میں ردیف وقافیہ کی تنگ دامانی کے باوجود کتنے استمساک واحتناک کے ساتھ دل گیر وروح فرسا روداد غم کہہ دی اس کو کہتے ہیں قادرانہ کلام بلکہ میں کہوں گا کہ یہ قاہرانہ نظام ہے ’اف‘ کس رقت خیز پیرائے میں کہا ہے کہ ’اف‘ میں ساری تاثیر خیز کیفیات شدت ریز جذبات اور قیامت خیز المیت دل گیر واردات اور دل دوز وجگر سوز تاثرات اور روح فرسا مشاہدات قلبی سما گئے ہوں یہی شاعر کا کمال ہے جو شعر کے سراپردہ میں عیاں بھی ہے اور نہاں بھی لیکن بین السطور پڑھے جاتے ہیں اور قاری اور سامع کو محصور ومسحور کر دیتے ہیں۔ الفاظ میں جان عزیز وغریز ہوتی ہے وہ رلاتے ہیں وہ ہنساتے ہیں وہ تڑپاتے ہیں وہ خود بھی تڑپتے ہیں لیکن برمحل استعمال اور خیال کی چابکدستی سے جب گرفت ہو تو افسانہ کو حقیقت بنا دیتے ہیں۔ حقیقت کو کس انداز سے افسانہ اور خواب بتا دیا کہ ہر حقیقت خواب ہے یا افسانہ

ہر شئے بجائے خود ہے فی الجملہ اک حقیقت
پھر بھی ہر اک حقیقت یا خواب یا فسانہ

عشق بھی اک حقیقت ہے لیکن یہ ایک خواب بھی ہے اور افسانہ کا فسانہ اور حقیقت کا آشنا بھی اسی خواب رنگین اور فسانہ کی حقیقت اور شدت عشق فراواں کی لذت دوز کارفرمائی کس شان محاکات سے بیان کی ہے شعر خود بول اٹھا

مسکراتے ہوئے وہ جام بڑھانا ان کا
کوئی انکار کا پہلو ہی نہ تھا کیا کرتا

معاملہ شان تغزل کا امتیاز اور سحر کار اسلوب ہے حسن وعشق کے سانحات واردات ومشاہدات، رموز ونکات، راز و نیاز حسن وعشق عاشق ومعشوق کے معاملات اسی انداز بیان کے ترجمان ہیں جو شعر کو شعر بنا دیتے ہیں اور تغزل میں تجمّل وتفضّل اور تشکّل کی جادو سامانیاں پیوست رگ جاں کر دیتے ہیں اور شعر کو شاہکار تغزل بنا دیتے ہیں۔ معاملہ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے

بے مروت بے وفا کہنے پہ یہ خفگی ہے کیوں
بے مروت بے وفا بھی ہیں تمہارے نام کیا
بندہ پرور اک ادنیٰ سی توجہ کے لئے
عمر بھر تڑپا کرے گا ناطقؔ ناکام کیا

تغزل کے ساتھ معاملہ کی کارفرمائی دیکھئے

وہ با وفا نہیں ہے نہ ہو، بے وفا تو ہے
دنیا میں اپنا کوئی نظر آشنا تو ہے

غزل کو پروفیسر رشید احمد صدیقی نے شاعری کی آبرو کہا ہے۔ فی الحقیقت غزل شاعری کی ہی نہیں اردو ادب العالیہ کی بھی آبرو ہے اور ادب العالیہ زندگی کی ترجمانی زندگی کے مشاہدات وواردات محرکات ومحسوسات کو صرف غزل اور صرف غزل سمیٹ لیتی ہے حضرت ناطقؔ خود ناطق غزل ہیں جنہوں نے غزل کے تمام محرکات ومحسوسات اور لذت دوز حادثات وواردات کو اپنے مختصر 'سخنِ معتبر' میں سمو دیا ہے۔ غزل ان کی زندگی ہے اور وہ غزل کی زندگی، غزل ان کی آبرو ہے اور وہ غزل کی آبرو۔ وہ تو سراپا تغزل، تشکّل، تجمّل اور تخیل کی مصور روح پر فتوح ہیں جنہوں نے دروں بینی فرط ضبط اور نشاط آفریں شدت غم سے اپنی تاثیر خیز نطق وگویائی اور جلوہ طراز افتادِ طبع کی حیرت سامانیوں اور جلوہ بداماں نیرنگیوں سے غزل کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں مظاہر فطرت اور انوار کائنات غزل میں سما جاتے ہیں اور جب ان کا انعکاس وانغماس ہوتا ہے تو وہ واردات وسانحات جواہر ریز اور زواہر پارے بنتے ہیں اور جب وہ طوفان خیز آنسو بن کر دل سے نکلتے ہیں تو کہیں عروس نو بہار کے ارکان فرق پر افشاں بنتے ہیں کہیں فرق آسمان کی کہکشاں لیکن وہی آنسو جب پیوست رگ جاں ہوتے ہیں تو موتی لعل وجواہر وزواہر بنتے ہیں یا چمن کے پھول میخانہ کے ساغر سرشکہائے سرمہ آلود اور شکستہ تاروں سے بکھرے سوز وساز کے ترانے اشعار میں ڈھلنے لگتے ہیں یہی وہ مقام سحر ہنگام ہے جب ہجر لذت آشنائے وصال اور شدت غم نشاط افزاء ہو جائے تو جادو ساماں حشر بپا شعر تاثیر خیز غزل بن کر سراپا حشر آگاہ اور فلک بارگاہ ہو جاتا ہے اور شاعر فرش نشین ہوتے ہوئے بھی حشر مکیں ہو کر تار رگ جاں اور خون جگر سے تڑپتا ہے تو محشر بپا ہوتا ہے تو

وہ شعر ناطق عاتق ہی ہوتا ہے۔یہی شعر'سخن معتبر' بن کر شاعری کی عظمت فکر داستان اور نزہت ترجمان بن جاتا ہے اور کہیں بارگاہ تغزل اور کہیں جلوہ گاہ تفضّل و تجلل کہیں سرمہ آلود سرشکہائے مشکبار کہیں شعلہ کہیں شبنم اور کہیں برق وشرر بن کر بارگاہ قلب وجگر اور رواق منظر چشم میں سما جاتا ہے

کہیں شعلہ کہیں شبنم کہیں برق و شرر ہوکر
تمہیں تم سامنے آئے ہو ہم گزرے ہیں جدھر ہو کر

گزرگاہ عشق کی جادہ پیائی اور شوق صحرا وردی میں آبلہ پائی کا صلہ تو ملاحظہ ہو

ہمیں بھی فخر ہے یہ ہم بھی گزرے ہیں جدھر ہوکر
بہاروں نے قدم چومے ہیں فرش رہ گزر ہو کر

شوق سحرا وردی اور عالم محویت کی سلمیت اور منزلت ومرتبت تو دیکھئے

ہمارا بھی سلام شوق کہہ دینا بیابانوں
کوئی گم گشتۂ منزل اگر گزرے ادھر ہو کر

شوق جنون وسرمستی وسرشاری اور گم گشتۂ منزل کی پامردی سے جستجوئے حصول منزل مقصود کا ایسا مقام سحر ہنگام ملا ہے کہ گزرگاہ عشق سرمدی کا ذرہ ذرہ اب تک سربسجود ہے اور جو گزرگاہ عشق میں منزل جاناں پہ ثابت قدم پہنچ جائے تو ذرہ ذرہ عالم محویت میں سربسجود رہتا ہے

تیرے کوچے کا ذرہ ذرہ اب تک سر بسجود ہے
نہیں معلوم ایسا کون گزرا تھا ادھر ہوکر

گزرگاہ عشق میں جو خلش ہائے ناز کی جلوہ نمایاں اور لذت دوز اور نشاط افزا حیرت سامانیاں ملیں ہیں ان کا تو کیا جواب لیکن وہ ایک خلش جو درد جگر بن کر رہ گئی وہ متاع عشق کی بلائے بے درماں ہے' درد جگر بن کر رہ گئی' سے پہلے'اف' مقدر ہے جس نے عشق کو سراپا جاوداں جادو ساماں اور تار رگ جاں کو مسیح زماں بنا دیا

خلش ہائے نگاہ ناز کی کیا بات ہے ناطقؔ
مگر وہ اک خلش جو رہ گئی درد جگر ہو کر

یہ اسی خلش درد جگر کی کارفرمائی ہے جس کی شدت خیز حرماں نصیبی نے ہجوم ظلوم کو قیامت خیز اور محشر بپا بنا دیا ہے

آج ہی مایوسیوں کا اس قدر کیوں ہے ہجوم
پھر نہ آئے گی شب غم پھر نہ ہوگی شام کیا

اس قیامت خیز حرماں نصیبی نے عشرت اور شام انبساط دونوں کی پرکار اسلوب میں لف ونشر کی تفسیر بے نظیر کی ہے اور جو شکست خوردنی ونامرادد لی کی اس شان امتیاز سے تشریح کی ہے کہ شعر میں لذت عشق کی پہنائیوں میں تڑپ اور رقت اور قاہرانہ حکمرانی پیدا ہوگئی ہے

صبح عشرت راس آئی اور نہ شام انبساط
ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں صبح و شام کیا

اسی مضمون مامون ومصئون کواسی آہنگ ورنگ لب ولہجہ میں ملاحظہ فرمائیں

بندہ پرور ایک ادنیٰ سی توجہ کے لئے
عمر بھر تڑپا کرے گا ناطقؔ ناکام کیا

عمر بھرتڑپنے کے لئے گداز وسرفراز سینے میں ایک حشر بپاہے جولازوال عشق کی دین ہے

یہ اور بات ہے کہ نہ آئے زبان پر
سینے میں ایک حشر تمنا برپا تو ہے

ایک حشرتمنالئے ہوئے وہ گرفتاروفاو جفاناشادونامراداحباب والباب سے شکوہ کرر ہے ہیں کہ ناطقؔ ناشاد کی بھی خبر ہے کہ وہ عالم درعالم کس عالم لامکاں میں ہے

ناطقؔ ناشاد کی بھی کچھ خبر ہے دوستو
جانے کس عالم میں ہے وہ اب گرفتار وفا

کس سلیقہ سے رنگ تغزل کو برقرار رکھتے ہوئے معاملہ عشق ومعشوق کے راز ونیاز انداز جفااور آداب وفا کے مسحورکن لب ولہجہ میں شعر کہے ہیں کہ شان تغزل اور معاملہ بندی کی واقعی تصویر کھینچ دی ہے

یا ہمیں کو باوفا کہتے ہوئے آتی ہے شرم
یا ہمیں ہم تھے کبھی آئینہ بردار وفا
اس توقع پر تو ہم برسو جئیں گے چارہ گر
جان لیوا ہے تو کیا ہے، ہے تو آزار وفا

وفا جوروستم ناز وانداز میخانہ پیمانہ صبر وقرارشکست دل، بہاروخزاں، ہجروفراق ووصال شعلہ وشبنم، برق وشرر، شراب ناب بط وخم وکام ومینا یہ سب لوازمات تغزل ومعاملات، مشاہدات وواردات اورمحسوسات شاعری کی جان ہیں۔ کس نے کس اسلوب وترکیب سے نبھایا ہے وہی جادوسر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان اسالیب وتراکیب کے چندمعرکۃ الآراشعرملاحظہ ہوں

بقید ہوش رہ کر بھی جنھیں جینا نہیں آتا
خدا کی شان ہے وہ ہم کو دیوانے سمجھتے ہیں
سر محفل چھلک پڑتے ہیں میری تشنہ کامی پر
جسے ساقی نہ سمجھا اس کو پیمانے سمجھتے ہیں
غرور حسن ناز دلبری کو کوئی کیا جانے
یہ ان کی بات ہے یہ ان کے دیوانے سمجھتے ہیں

'غرورحسن ناز دلبری' کوکس نزادلبری کے ساتھ مختصرکر کے بیان کیا ہے کہ وہ اورافسانہ درافسانہ ہوجاتا ہےاور پھر'ان کی بات' کہہ کرتو شعریت میں نشتریت

اور رمزیت پیدا کر دی ہے۔ کسی نکتہ رس بے محابہ انداز میں آسمان کو للکارا ہے کہ شعر میں توانائی کے ساتھ زور بیان اور ایک شگفتہ مذاق شعری نے نکھر کر جو تیور پیدا کئے ہیں اس سے شعر میں نشتریت پیدا ہو گئی ہے اور رقت خیز رمزیت اور لذت دوز اشاریئت نے تو جان سی ڈال دی ہے

ہوشیار اے آسماں اے دشمن صبر و قرار
آج کچھ بدلی ہوئی ہے لے مری فریاد کی

کیا تیکھے تیور اور معاملات حسن وعشق کے تقاضے ہیں شعر کیا ہیں دل ودماغ کو چھونے والے اور لذت آشنا نشتریت کے مرہون منت ہیں

رندوں پہ بھی اب گردش دوراں کی نظر ہے
لانا میرا ٹوٹا ہوا پیمانہ کدھر ہے
چاہوں تو چمن زار کو شعلوں میں بدل دوں
لیکن ابھی تزئین گلستاں پہ نظر ہے
نگاہ عشق جب شریک حسن ذات ہو گئی
فلک جناب بن گئی ملک صفات ہو گئی
وہ اک صدائے دل نشیں کہ لفظ کن کہیں جسے
اٹھی جو وسعتیں لئے تو کائنات ہو گئی
ان کے حریم ناز کے پردے نہ جل اٹھیں
اے آہ شعلہ بار خبردار دیکھنا

کیا تیور ہیں کیا معنویت اور نشتریت کہ حسن وعشق کے معاملات اور فلسفۂ خودی و بےخودی خودآگہی وخودفراموشی کے عوارف ومعارف اشعار میں خود بخود ہی مظاہر ومناظر بن کر جلوہ گر ہو گئے ہیں۔

سرمستی وسرشاری عشق نے نگاہ آشنائے بہار اور چمن زار فطرت کی نیرنگیوں میں محوئے تماشہ بن کر گل وخار ونکہت ونزہت وداممن فصل بہار اور نگہہ معتبر سے شعر کو تماشا گاہ عالم بنا دیا ہے کہ ہر پھول خار اور ہر خار بہار بےخزاں بن گیا

ہر پھول خار ہے نگہہ اعتبار میں
اب کیا رکھا ہے دامن فصل بہار میں

دامن فصل بہار کی خزاں رسیدہ صحرا نوردیوں اور بےمرام بےدام، زلف شب دراز کی ظلمتوں میں وہ کھوتا ہے، بہکتا ہے پھسلتا ہے پھر سنبھلتا ہے پھر بے یار ومددگار صبح صبیح کی جستجوئے لازوال میں کھو کر تشکیل بہاراں اور تکمیل گلزار نو آفریدہ سحر خیز امید میں وہ تشنۂ شب انتظار بن کر بے نیاز صبح وشام لذت کیش شام الم اور فرقت شب انتظار میں کھو جاتا ہے۔ جہاں نہ شام سحر ہے، نہ ظلمت کدۂ ہجر کی بےثباتیاں ہیں۔ ایک ایسی صبح بہاراں کی امید میں جی اٹھتا ہے ہے کہ جس کی نہ شام فرقت ہے نہ شب فراق

اک ایسی صبح جس کی کوئی شام ہی نہیں
تشکیل پا رہی ہے شب انتظار میں

اسی صبح بہاراں کی تشکیل نو دمیدہ اور فصل نورستہ کے ہنگام میں نظر شوخ وشنگ کی شوخیاں اور عذوبت بیانیاں بھی ملاحظہ ہوں

ابھی جو کچھ جھکی ہوئی ہے ابھی جو کچھ رکی ہوئی ہے
دلوں کی باتیں کرے گی اک دن یہی نظر شوخ و شنگ

تغزل شعار اشعار زرنگار و دل فگار ملاحظہ ہوں جو میں سمجھتا ہوں ایک ایک شعر اپنی جگہ بمنزلۂ غزل اور سراپا تجمل تغزل ہے

درد دل ہے آج ٹھہرا ہوا
چارہ ساز بے کساں یہ کیا ہوا
ہم کو اپنی یاد آتی ہے یوں
جیسے کوئی خواب ہو بھولا ہوا
کہتے کہتے رک گیا کیوں نامہ بر
ہاں خدا کے واسطے پھر کیا ہوا

'ہاں خدا کے واسطے پھر کیا ہوا' نے شعر میں غضب کی تاثیر اور قیامت خیز رقت پیدا کر دی ہے ایک ہی شعر میں داستان عشق روداد بربادئ دل شکست آرزو اور حرماں نصیبی اور قیامت خیز واقعات و واردات و مشاہدات سمودئے۔ان ہی واردات و مشاہدات کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک شعر متغزل ہے

ابھی تو شاد ہو دل میں مری بربادئ دل سے
بہت پچھتاؤ گے جس روز اٹھ جاؤں گا محفل سے
یہ کیا مہر و محبت ہے یہ کیا ناز و نمائش ہے
بلاتے بھی ہو محفل میں اٹھاتے بھی ہو محفل سے
خدا ہی جانے زمانہ کیا کیا فسانے ان کے بنائے ناطقؔ
وہ چند آنسو جو ان کی آنکھوں سے وقت رخصت چھلک گئے ہیں
بہ قدر ضبط دل پر جبر کر لوں گا مگر یارو
شکست آرزو پر آنکھ بھر آئی تو کیا ہوگا
میری نگاہ میں شمس و قمر سما نہ سکے
یہ آئینے بھی تمھارا جواب لا نہ سکے

حسرت صبح تمنا تیرا انجام بخیر
سحر آثار نہیں تیرگی شام ابھی
نہ مرکز برق طور سینا نہ در خور لطف خاص موسیٰ
نظر جسے سرفراز کردے طلب جسے کامیاب کردے
کہاں کی شمع محفل کس کی محفل کیسے پروانے
سحر ہونے سے پہلے ختم ہیں یہ سارے افسانے
حصول آرزو پر اس قدر نازاں نہ ہو ناطق
لبوں تک آتے آتے بھی چھلک جاتے ہیں پیمانے
سنتے ہیں بجلیوں نے گلشن کو پھونک ڈالا
کیا ہم نشیں یہ سچ ہے اف میرا آشیانہ
دیکھئے ہنستے ہنستے دل کھنچ آئے نہ نظروں کے ساتھ
اس محبت سے مری جانب نہ دیکھا کیجئے
ذوق کامل ہو تو ہر ہر لمحہ عمر جاوداں
یہ نہیں تو پھر حیات سرمدی کچھ بھی نہیں
گدائے میکدہ ہوں تشنہ لب ہوں دور بیٹھا ہوں
میرے ساقی ادھر بھی اب تو دور جام آ جائے
آنکھوں میں حیا ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم
یوں بھی مری نظروں کی پذیرائی ہوئی ہے
غم و اندوہ صبر و یاس جبر و ناشکیبائی
یہ میری زندگی کے چند اجزائے پریشاں ہیں

یہ حضرت ناطق کی پروردۂ غم وآلام زندگی کے چند اجزائے پریشاں ہیں جو لب پہ آتے آتے نالہ وغلغلہ آہ وبکا بن گئے یا اشعار شعور وظہور ونشور میں وضع ہو گئے لیکن جب کاغذی پیرہن میں جلوہ گر ہوئے تو جواہر پارے اور شاہکار گہر ہائے شب چراغ تمنا بن گئے ان میں کیا نہیں ہے دل کی تیرگی آثار شکست خوردنی حرماں نصیبی بے ثباتی ناز وفغاں مشاہدات وواردات، سانحات ومحسوسات اور معاملات وحادثات جو انہیں تغزل وتخیل کے آئینہ دار فطرت اور سحر طراز جدت کے روابط وضوابط ہیں انہیں سحر طراز لوازمات ومعمولات نے کلام بلاغت نظام کو جلوۂ صد رنگ اور مظہر مظاہر ارژنگ وارغنگ بنا دیا

سخن معتبر کے کلام فہام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ناطقؔ خود پروردۂ ستم ہائے روزگار ہی نہیں خوگر ستم ہائے یار دل فگار بھی ہیں جن کے ایک ایک شعر میں جذبۂ تڑپ اور رقت خیز حرماں نصیبی دردمندی درماندگی ووماندگی اور تخیل کی علو بیانی زبان و بیان کی نرنگی ندرت طرازی اور فکر ونظر کی گہرائی و گیرائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔واقعی ناطقؔ تو مذاق شعریت اور نطق تغزل اور سراپا تغزل وتخیل ہیں وہ کیا نہیں ہیں۔ایک نغز گوشاعر اشعر صاحب طرز طراز ،مصور فطرت چمن بند گلزار شارستان محرم راز وناز ونیاز عاشقی ودلربائی اور گل صد برگ اشعۃ اللمعات سر بزرگ شعروسخن اور ناطق منطوقات معنبر یعنی خالق سخن معتبر ایسا کلام معتبر جس میں جدت طرازی تنوع شان محاکات شوکت بیانی نکتہ پروازی اور تجمل وتغزل وتفکر وتخیل کی حیرت سامانی اور عامۃ الورود تخیلات کی سحر بیانی بھی ہے اور تکلم وترنم کی حکمرانی بھی ہے۔کہنے کو تو وہ نخبۃ الفکر شاعر غزال جواں ہیں لیکن صفوۃ النظر سخنور سخنوراں اور گہر فشاں شاعر سحر بیاں اور ناطق زباں داں بھی ہیں اور ماویٰ مالوہ کے گل سرسبد سرآمد بھی۔

حضرت ناطق ایک شخص ہیں جن کے کئی عکس ہیں کئی ذوات وصفات اور لمعات ہیں ایک ناطق ہو تو بیان کریں یہاں تو ناطق ہی شعروسخن کے عنوان ہر ورق بن کر جلوۂ صف رنگ بنے نظر آتے ہیں خالق منظومات فائق غزلیات شائق محاکات اور خالق واردات صاحب مشاہدات محسوسات اور عاتق محرکات ومکاشفات اور جب ان تمام صفات وذوات کو مجتمع کیا جائے تو ناطق مالوی ہی مظہر ومحضر عالم تماشا گاہ سالم بنے نظر آتے ہیں۔

ایسے جامع الحیثیات اور مستجمع الصفات شاعر ناطقؔ کے لئے کچھ لکھنا میرے لئے نہ صرف باعث فخر ومباہات ہے بلکہ از دیاد شان وصولت و شوکت کا سبب افتخار بھی ہے اور میری تحریر وتقریر کا اعتبار واقتدار بھی۔میں تو اپنے آپ کو خوش نصیب وافر نجیب سمجھتا ہوں میرے محبّ مکرم جناب پروفیسر شاہد میر دبیر شہیر نے اپنے نانا جان جناب ناطق مرحوم کے کلام خجستہ فرجام پر مجھ سے یہ تقریظ مغیظ لکھوا کر مجھ پر احسان وامتنان کیا ہے۔اتنے بڑے دیدہ ور شاعر پر لکھ کر میں خود بڑا ہو گیا۔ایک ادیب تادیب فقیر وحقیر کی حیثیت سے تو میں جناب شاہد میر کو مبارک باد دیتا ہوں کہ حضرت ناطق پر انہوں نے یہ گراں قدر کتاب مستطاب ترتیب دے کر نہ صرف ان کو زندہ کر دیا بلکہ خود بھی زندۂ جاوید ہو گئے۔شاہد میر ابن شاعر بن شاعر ہیں۔یہ خود شاعر ان کے والد محترم میر عرفان صاحب شاعر ان کے دادا محمد میر خاں عاجزؔ شاعر مستزاد یہ کہ ان کے نانا بھی شاعر ہیں۔تین پشتوں سے ان کو وراثت میں دراست وسیادت شاعری ملی ہے۔وہ بھی شاعر امیر ہی نہیں بلکہ زعامت دراست کے بھی میر ودبیر ہیں۔ادیبوں کے شاہد، میر وامیر کے ناطق وشاہد مشہود و مشاہد بھی۔

اپنے جد امجد (میر محمد خاں عاجزؔ) سے سلاست وسلامت مذاق ملی ہے۔نانا جان (حضرت ناطقؔ) سے نطق شعریت ومعنویت اور والد ماجد (حضرت میر عرفانی) سے نغزیت وغنائیت اور خود سے انھیں خود موسیقیت ملی ہے،انہوں نے جدید شاعروں کو نیرنگی تخیل زبان و بیان کا تجمل وتشکل اور مست وبےخود کرنے والی مسحورکن موسیقیت دی ہے وہ زندہ شاعر تو ہیں ہی ان وراثتوں کی دین نے ان کو زندۂ جاوید کر دیا۔یہ حضرت ناطقؔ اور حضرت محمد میر خاں عاجزؔ کے صحیح معنی میں جانشین وصدر نشین ہیں۔شعریت اور غنائیت کے لحاظ سے شاہدؔ، میرؔ وغالبؔ کے متبع تو ہیں ہی لیکن جو شاعری میں انہوں نے موسیقیت کے دلربا روح پرور چنگ ورباب ومضامیر وارغنون شہر ودوشاہ دود کی نیرنگیاں اور نواسنجیاں مضراب دل سے اس مسحورکن انداز شاعرانہ سے بکھیری ہیں کہ وہ خود موسیقی کے شہر ودوشاہ دود اور شعروسخن کے شاہدؔ، میر تغزل بن گئے ہیں۔

حضرت ناطق پر یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور سرونج کی علمی ادبی اور ثقافتی تاریخ کے مراجع م منابع کا ایک بیش بہا خزینۂ پارینہ ہے۔سرونج کہنے کو ایک قصبہ ہے لیکن اپنی عظمت دفینہ اور علمی ثقافتی وراثت ازمنہ سے ایک گہوارۂ علم وادب، شارستان شعروسخن اور علم وعلم وقلم کا

دبستان رہاہےاورآج بھی اپنے مشاہیرشعراءعلماءادباءکی یادگارروایتوں اور درایتوں کوسمیٹے ہوئے اپنے جلو میں علم وادب کے عبقری پیکر مشاہیر کو لئے دنیائے ادب میں اپناایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔اس دورابتلا میں بھی مرزامسیح اللہ بیگ صاحب،مفتی عبدالمجید صاحب،مولوی نذیرالدین صاحب،حکیم فخراحمد صاحب،مولاناسمیع اللہ بیگ صاحب،قاری شفیع احمد صاحب،قاری صغیراحمد بسمل،غازی ولی احمد مبلّغ ایسی متدیّن شخصیات اور پروفیسرڈاکٹر مظہر بقا،پروفیسر نظامی،ڈاکٹر مختار شمیم،پروفیسر خالد محمود،ڈاکٹرسیفی،ڈاکٹر شان فخری،ڈاکٹر النبیٰ ادریس جیسے گہر ہائے شب چراغ اور مرتضیٰ نظر،دانش مالوی ،ناطق مالوی،نشاط،راز،ڈاکٹرعزیز ضیااسدی،میرعرفانی،مسیح نفس اورشاہد میر،راہی قاسمی،عرفان وانجم جیسے شعرا گہرسپہرعلم وادب میں ضوفشاں کہکشاں بنے سرونج کوایران کےشہراشہرسروج بنائے ہوئے ہیں اورجن کے میرکارواں ناطق ذیشاں شاعرتلمیذالرحمان ہیں

☆☆☆☆☆

حوالے:

(۱) صاحبزادہ عبدالکریم خان شرق بن نواب امیرخان والی وعالی متعالی ٹونک

(۲) فقیرمحمدخاں گویاجدامجدحضرت جوش ملیح آبادی

(۳) شیلےانگریزی ادب کاایک ماہرفن شاعروادیب تھا

معاصراردوشاعری کی ایک منفردآواز

ملکہ نسیم
ڈاکٹرثروت خاں
ریٹائرڈپروفیسرمیراگرلس کالج
اودے پور(راجستھان)

ملکہ نسیم کی شاعری کی جمالیات کا رنگ وروپ منفرد ہے وہ اردوشاعری کی ایک معتبر آواز ہیں ۔جس طرح ہرفن کار داخلیت وخارجیت سے متاثر ہوتا ہے اوراپنے اظہار میں ان خیالات واحساسات اورمحسوسات کوالفاظ کامخصوص جامہ پہنا کراپنے شاہکارخلق کرتا ہےاسی طرح ملکہ نسیم کی شعری کائنات میں فن کاری کی وہ قوس وقزح جلوہ گر ہے جسے سنجیدہ شاعری کے ضمن میں دیکھا پرکھا جاتا ہے۔سنجیدہ سے مراد ہے کلام میں گہرائی وگیرائی کے باہم کلاسکیت یاادب عالیہ جدیدیت اورمابعدجدیدیت جیسے ادبی رجحانات کی فکرکی چھنتی ہوئی خالص روش ،رواوررجحان ۔۔۔اوراسی کے ساتھ اپنا منفرد لہجہ۔۔جوپکارپکارکراپنے امتیازکوبیان کرتا ہوا،اپنے ممتاز ہونے کی آہٹیں پیدا کرتا ہے۔اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔یہ احساس ملکہ نسیم کی شاعری میں ان کے موضوعاتی سطح،اسالیب بیان کی سطح،دردواثر کے متاثرکن اثرات کی سطح اورشعری وفنی رموز کی سطح پر یہ خوبی نظر آتی ہے۔جوحمد وثنا سے شروع ہوکرنعت اورآپ بیتی کوجگ بیتی بنانے کےتصورات سے ہمکنار ہوکراپنی رسائی کرتا ہےمثال کےطور پرحمد ونعت کا یہ اندازغزل اورنظم میں کس طرح ڈھلا ہے ملاحظہ فرمائیے

ٹوٹتے خوابوں کو منظر دے دے
یعنی صحرا کو سمندر دے دے
آبلہ پائی مقدر میں رکھ
ہاتھ اٹھاؤں تو گل تر دے دے
میرے ہاتھوں کو قلم کردے مگر
جو نہ خم ہو وہ سر دے دے

نظم حرف ’کن‘ کے یہ نعتیہ مصرعے دیکھئے

کھلے ہوریگزاروں میں پھول بن کر
تمھاری خوشبو سے مہک مہکا ہے سارا عالم
آ گئے اندھیروں میں بن کے سورج
منارۂ روشنی بنے تم
بنائے دانشوری بنے تم

ہےانتہاعلم وآگہی کی
قرآن اترا، نبی بنے تم
تمھیں عناصر کو دے گئے ہو حرارتیں بھی
تمھیں نے سارے جہاں کو نقش دوام بخشا
پیام حق کے سفیر بن کر
بنے محافظ صداقتوں کے
تمھیں بنے حرف 'کن' کے سامع
تمھیں میں شامل رضائے باری

شاعری کا اہم وصف ہے بات کو اشارتاً وکنایتاً بیان کرنا، ملکہ نسیم کی شاعری میں یہ وصف اپنی جمالیات کے ساتھ نظموں اور غزلیات کے اشعار میں مصرعے مصرعے سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ صداقت اور حقیقت کو ملائمت اور نرم روی کی شبنمی ٹھنڈک سے دل دے دل تک کے راستے مؤثر انداز میں وا کرتا چلا جاتا ہے۔ ملکہ نسیم مفاہیم کی ان راہوں کی استواری کا اپنی شاعری میں بہ حسن وخوبی اہتمام کرتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم 'سجدہ' احساس دیکھئے کہ وہ حرارت طاری ہو جاتی ہے جو آج کے منظر نامے کے مشاہدے کی ترجمان ہے۔ فکر وخیال کی وسعت کے ساتھ درد واثر رکھتی ہے یہ نظم:

وہ اک سجدہ
علامت تھا جو عظمت کے تقدس کا
وہی سجدہ جبینوں سے نکل کر
آج راہوں میں، گلیوں میں سجا ہے
اور اب جا گیر کہلاتا ہے
کچھ مردہ پرستوں بے ضمیروں کی
سجے ہیں آج ان سے
کچھ سلگتے گھر

اب غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کیا پوچھتی ہے باد مخالف کہ کیا ہیں ہم
موجوں کا رخ جو موڑ دے وہ حوصلہ ہیں ہم
اگر چاہوں جھٹک کر توڑ دوں زنجیر تنہائی
میں تنکا ہوں مگر موجوں سے ہے میری شناسائی

غزل کے یہ اشعار انسان کے ہونے یعنی 'ہست' کا ثبوت دیتے ہوئے 'باد مخالف' میں حوصلہ کے باہم آگے بڑھتے ہوئے موجوں کا رخ موڑ

دینے کی بانگ سناتے ہیں۔شاعری کا عزم وحوصلہ ظلمت کدہ میں روزن کی بشارت دیتا ہوا جب قاری کے باطن کی ڈور کو مضبوطی سے تھام کر غور وخوض کی دعوت دیتا ہے تو قلم کا حق ادا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔غزل کے یہ دو اشعار اپنی تہہ داری کا کمال دکھاتے ہوئے فیمینزم کا قوی احساس بھی کرواتے ہیں،لیکن ملکہ نسیم کی شاعری کہیں محدود دائرہ کی قید سے آزاد ہو کر انسانیت کے مثبت پیغام کی صدا دیتی ہے۔۔۔سنسکرت ادب میں جذبوں کے متفرق اثرات و کیفیات کو مترشح کرنے کے لئے نو رسوں کا ذکر ملتا ہے۔فنون لطیفہ کی محویت سے گزرتے ہوئے انسان کے حواس خمسہ میں حرکت وحرارت کے تار جب اپنے سر چھیڑنے لگتے ہیں تو وہ آدمی سے انسان بننے کی شاہراہ پر گامزن ہونے لگتا ہے۔ملکہ نسیم کی شاعری میں ان رسوں کے یہ عناصر موجود نظر آتے ہیں

ہوگی اک دن حکمراں پھر عظمت لوح و قلم
ہے یقیں مجھ کو ایسا دور بھی دیکھوں گی میں

دیکھئے اس امید کے ساتھ وہ آگے قدم رکھتی ہیں تو زندگی کے مختلف رنگوں سے ان کی کیفیات کے اسباب کیسے رواں دواں نظر آتے ہیں۔

فطرت کے قرب میں نشاط کا رس:

شاخ گل، رنگینیاں، پروائیاں، بھیگا سماں
لکھ رہا ہے کون موسم کی انوکھی داستاں

یاس وامید کا رنگ دیکھئے:

کچھ شکستہ خواب لے کر شبنمی پلکوں کے ساتھ
حال کی دہلیز پر بیٹھی ہے یاد رفتگاں

نظم 'لمحوں کا حساب' میں لفظیات کی کاری گری کے دلکش نقش ثبت ہوئے ہیں۔ایسا لگتا ہے ملکہ نسیم نے حقیقت کے پردے سے باہر آ کر امکانات کے سخت دھراتل کو مسحور کر لیا ہے:

کیا کبھی تم نے تم نے گزاری ہے کوئی
ہجر کی شام
اور تنہا در و دیوار سے باتیں کی ہیں
تم نے دیواروں پہ لکھا ہے کوئی نام
ناخنوں سے کبھی کیا تم نے کریدی ہے میز
دھول جو عہد گذشتہ کی تھی
آئینوں پر
اس پہ تصویر کوئی تم نے بنائی ہے کبھی
گھر کے دالانوں میں، آنگن کے کسی گوشے میں
کسی بھٹکی ہوئی خوشبو سے ملاقات ہوئی

غم کسی اور کی پلکوں سے سمیٹے ہیں کبھی
روزن در سے درآئے جو اجالے ان سے
اپنی گم گشتہ تمناؤں کے دامن نہ بھرو
توڑ کر گذرے ہوئے کل کی
صداؤں کے طلسم
اپنے آنگن میں کبھی غم کی تلاوت بھی کرو

ناخنوں سے میز کو کریدنا، بھٹکی ہوئی خوشبو اور غم کی تلاوت کرنا۔۔۔۔۔۔۔ایسے رمز ہیں جس نے اس نظم میں جدت، طباعی کی تازگی کو ہموار کیا ہے نفسیاتی کشمکش کے ساتھ خیال افروز آہنگ کے امتزاج کو پیش کرنے میں ملکہ نسیم کامیاب ہیں

ملکہ نسیم کی شعری کائنات میں صنائع بدائع، علامتی نظام، تشبیہات واستعارات کی جدتیں، فکر کا توازن اور بیان کی ترسیل کے مراحل ان کی فن کارانہ صلاحیت کی داد دیتے ہیں نظم 'تضاد' میں خود صنعت تضاد کی تصویر نظر آتی ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

ہمارے آنچل میں خشک موسم
تمھاری آنکھوں میں
سبز موسم کی آہٹیں ہیں
بہار کی سگبگاہٹیں ہیں
ہماری آنکھوں میں چپکے چپکے
سلگ رہے ہیں بہار چہرے
ادھر تخیّل کی جنتیں ہیں
ادھر سرابوں میں میرے خوابوں
کی کرچیاں ہیں
ادھر تو خوشیوں کے کینوس پر
ہزاروں رنگوں کے جمگھٹے ہیں
ادھر وفا کا برہنہ سورج
تمازتوں کی ردا اتارے
جھلس رہا ہے یقیں کے چہرے
بجی بجی
ہیں گماں کے موسم کی خوابگاہیں

خوشی کا لشکر صفیں جمائے
تضاد کی اس بساط تک
آ کے رک گیا ہے

ملکہ نسیم کے یہاں برہنہ سورج، آفتوں کی سحر، اداس جگنو، سوالات کے چٹیل علاقے، طلب کا سمندر، الجھنوں کی مشعلیں، غم کی دعائیں، ریگ زار، گناہوں کے پھل، رنجشوں کے مکالمے، سحر کی دھوپ، لہجہ کی ٹھوکر، زہر کی بوندیں، ہوا موسم کی رقاصہ، پتوں کے گھنگھرو، خوشبو کے سفیر، لمحات کی جھیلیں، زیبرا کر سنگ سی لائینیں، درد کی تتلیاں وغیرہ جیسے متعدد معجز نما اور فکر پرور شعری نقوش ہیں۔ جس میں علامتی نظام، اظہار و ابلاغ کی خلاقانہ روا اور نئے شعری نظام کی شگفتگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے

ان کی نظر نئے سماجی و سیاسی مریضانہ حالات کا جائزہ لینا بھی بہ خوبی جانتی ہے۔ نظم 'سوال' پڑھئے تو اختتام پر آپ چونک جائیں گے۔ حواس پر بجلی سی گرے گی اور پھر ازل سے ابد تک کا منظر نامہ آپ کے تخیّل کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گا:

خیالات کے بیکراں اور گھنے جنگلوں میں
یہ انسان ہیں یا ہیولے ہیں ان کے
سوالات کی جن پہ یلغار ہے
یہ کوشاں رہے ہیں جوابات کی چاہ میں
زمیں، آسماں، شہر کی بستیاں
درد کی تتلیاں، گھر سے اٹھتا ہوا دھواں
بچپنے کی ہمکتے خوشی کے سوال
نوجوانوں کے آگے بھٹکتے سوال
اب بڑھیا کی دہلیز پر آ کر ٹھہرے
ہوئے ہیں سسکتے سوال
اور جوابوں کی خواہش
بھیانک بھنور بن چکی ہے
اب انسان ان کا تعاقب کرے بھی تو کیوں کر
سوالات کا ایک چٹیل علاقہ
جہاں زندگی ایک تنہا مسافر
سرابوں سے بھٹکی، سمندر سے گزری
طلب کا سمندر بھی اب

ریگ زاروں میں تبدیل ہونے لگا ہے
مجھے خوف ہے کہ جوابات کی چاہ میں
کوئی پاگل سوالات کا یہ سمندر
جلا دے تو کیا ہو؟ (سوال)

آج کا موسم اس سے آگے کی وہ نظم ہے جس میں ان سوالوں کے جوابات کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے وہ خوشبو کے موسم کہاں گئے؟ وہ رفاقتیں، وہ صداقتیں وہ ان کے خوش نما جزیرے، وہ قومی یک جہتی، وہ خوشیاں، وہ ترانے، وہ محبتیں، وہ خلوص، ایثار، قربانیاں، رشتے۔نہیں اب کچھ نہیں بس نفرتوں کا غلبہ ہے حکومتوں کی خاموشیاں ہیں۔ بلند و بالا عمارتوں کے مہیب سناٹوں میں سب کچھ کھو گیا ہے۔خون ہے، شعلے ہیں، سلگتی آنکھیں ہیں۔اداس شامیں اور گناہ سے لدے ہوئے وہ درخت ہیں جن میں پھل زہر آلود ہیں۔ ملکہ نسیم نے اس نظم میں عصری حسیت کی وہ عکاسی کی ہے کہ جس کی فن کاری نے سمندر کو کوزے میں سمو دیا ہے نظم کی ابتداء میں وہ سوال کرتی ہیں

کہاں ہیں موسم وہ خوشبو کے

اس مصرعے میں جو خود اعتمادی ،غم و غصہ ،مصوری ،فکر ،غصہ ،جھنجھلاہٹ ،تحکمانہ صلاحیت کی کیفیات پوشیدہ ہیں وہ نسائیت کا وہ روپ ہے جو ہندو مائیتھا لوجی درگا دیوی کا خاصہ ہے۔ایک ایسا زوردار سوال۔کہ جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ پھر اس کے بعد پوری نظم مطالعہ کرنے کے لائق ہے

کہاں ہیں موسم وہ خوشبو کے
رفاقتوں کے صداقتوں کے
کہاں گئے وہ خوش نما جزیرے وہ الفتوں کے
جہاں پہ کچھ مختلف پرندے
الگ الگ تھی زبانیں جن کی
سنا رہے تھے بس ایک نغمہ
محبتوں کا

کہاں ہیں اب وہ ؟
ہر اک گلی میں ہر ایک کوچے میں
اب حکومت ہے خامشی کی
ہے آج حرف ونوا
یہ کیسا سکوت طاری
بلند و بالا عمارتوں کے مہیب سائے

سروں کو اپنے اٹھائے کرتے ہیں جیسے شکوہ
مرے الٰہی یہ شہر گریہ
یہ خوں کے چھینٹے
اداس شامیں
سلگتی آنکھیں
ہر اک شجر پر گناہ کے پھل لدے ہوئے ہیں
چمن کی ہر ہر روش پر
شعلے بھڑک رہے ہیں
وہی پرندے جو راگ الفت کا گا رہے تھے
اب ان میں آپس میں رنجشوں کے مکالمے ہیں
یہ کون ہیں۔۔۔؟ نفرتوں کی فصلیں اگانے والے
جو آج اس کو بھی ایک موسم کا نام دے کر
خدائی میں مداخلت کر رہے ہیں تیری
تو چپ ہے۔۔۔
کب تک تو چپ رہے گا۔۔۔؟

انھیں مشاہدات سے پر ملکہ نسیم کی ایک اور نظم 'یہ نفرتیں کیوں؟' ہے جس کے عنوان سے ہی نظم کے ماحصل کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ملکہ نسیم کے یہاں ترقی پسندی کی انسان دوستی یا اشتراکیت کے جذبات کی نظمیں اور اشعار بھی ملتے ہیں۔مزدور کا درد، غریب کی بھوک، عورت کا استحصال چاہے وہ جذباتی ہو یا رومانی، جسمانی ہو یا فکری، سرمایہ داری کی شدتوں کا احساس اور اس کے منفی نتائج کا عمل۔غرض ان کی شاعری میں زندگی کی تفسیر کی ترجمانی بڑے فن کارانہ انداز میں نظر آتی ہے۔شاعری میں نسائیت پوری طرح جلوہ گر ہے جہاں تانیثیت کی مند مند آنچ بھی ہے اور اپنے وجود کی شناخت کا تقاضہ بھی ہے۔یہ تقاضہ حق کے مترادف ہے۔حقوق کے حصول اور اس کی تکمیل کا ہے۔جس میں شدت نہیں جرأت نہیں لیکن ایک ایسی حرارت اور آنچ ہے جو اپنی بات منوانے پر اصرار کرتی ہے۔ملکہ نسیم کا لہجہ بڑا متوازن ہے۔اگر یہ توازن نہ ہو تو شاعری نعرہ بازی میں بدل جاتی ہے۔ان کے یہاں حالت زار کا رونا نہیں بلکہ نرمی سے، فہم سے، ادراک اور شعور سے اپنے وجود کو ثابت کارنے کا مادہ نظر آتا ہے

جہاں تک ملکہ نسیم کے مشاعروں میں شرکت کرنے اور داد حاصل کرنے کا معاملہ ہے وہ عالمی سطح پر مقبول ہیں۔نہ تو مشاعروں میں گاتی بجاتی ہیں اور نہ ایکٹنگ کرتی نظر آتی ہیں۔بے حد سلیقہ مندی اور سنجیدگی سے کلام سناتی ہیں۔سامع توجہ سے سنتے بھی ہیں اور داد بھی دیتے ہیں۔۔۔یہ توازن ہی انہیں ان شاعرات سے الگ پہچان عطا کرتا ہے جن کے بناؤ سنگھار، ناز نخروں اور اداؤں کو دکھانے کے لئے منتظمین ان کی شرکت کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ظاہر ہے سنجیدہ شاعری سے ایسی شاعرات کا دور سے بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

متذکرہ بالا جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دورحاضر میں ملکہ نسیم اپنی اردو شاعری کی جاذبیت کی بناء پر اس مقام پر ہیں جہاں فکری شعور بیداری کی حدود سے آگے بڑھ کر آفاقیت کی طرف گامزن ہوتا ہے۔۔کائنات، زندگی، سماج، انسان دوستی کے تجربات ومشاہدات کے فن کارانہ بیان نے ملکہ نسیم کو ایک بہتر پہچان دی ہے۔ان کا تخلیقی سفر ہنوز جاری وساری ہے اوران کا قلم شہ سواری کے مراحل عبور کرتا ہوا تیز رفتاری سے آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

اخلاق جہانگیری

ڈاکٹرمحمودفیاض
شعبہ اردوو، فارسی ذاکرحسین کالج دہلی

دنیا کی زندہ زبانوں میں فارسی ادبی سرمایہ کے لحاظ سے کسی دوسری زبان کے مقابلہ کم مائیگی یا تنگ دامنی کا شکارنہیں ہے۔انسانی زندگی کے سب ہی عنوانات اس زبان میں زیر بحث رہے ہیں۔ فارسی زبان نے جب اپنی جغرافیائی حدوں کو پار کر کے دور دراز کے علاقوں میں اپنے اثر ورسوخ بڑھائے تو نہ صرف یہ کہ لوگوں کے ۔۔۔۔۔۔دلوں میں اتر گئی اور دل کے جذبات زبان سے ادا کرنے لگی بلکہ اس نے دماغوں پر بھی حکمرانی شروع کردی اوراجنبی اورناموافق حالات میں بھی اپنارنگ جمایا۔

ہندوستان میں فارسی زبان کچھ اس طرح رائج ہوئی کہ اپنے اصل وطن سے زیادہ پر باراور پر کار ہوگئی۔ ہندوستان کی زرخیز سرزمین میں خوب پنپی اور نہ صرف پنپی بلکہ ہندوستان کے جغرافیائی نقشہ سے باہر ہندوستانی اثرات کے ساتھ پھیلی۔اب فارسی زبان ہند کے عظیم نقشہ پر اس حیثیت سے تو باقی نہیں ہے جس پر وہ چھ سات سو سال تک قائم رہی ،مگر آج ہندوستان میں فارسی کی اہمیت اوراس کی افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ اور زیادہ ہوگئی ہے کیوں کہ فارسی زبان نے اپنے طویل دوراقتدار کے دوران ہندوستانی تہذیب وتمدن، یہاں کے مذاہب،رہن سہن،کھانے پینے کی اشیاء، ہندوستانی زبانیں،علاقائی بولیاں غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو پر اپنے اثرات مرتب کئے،انسانی فکراور تخئیل کو اثر انداز کیا۔انسانی ترقی کے سفر میں قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھی۔آج اس عظمت رفتہ کے نشانات عجائب گھروں اور لائبریریوں کے خانوں کی زینت ہیں جس میں سے بیش تر بے توجہی اورگم نامی کا شکار ہو چکے ہیں۔ان آثار پارینہ کو لوگ اپنی ضرورت اور دل چسپی کے مطابق تلاش کرتے ہیں اوراپنے ذوق وشوق کے لحاظ سے چند جواہر پارے چن لیتے ہیں اور بقیہ گم نامی کا شکار رہتے ہیں۔

اسی طرح کے گم نام خزینہ میں سے ایک جواہر پارہ اخلاق جہانگیری ہے علم وادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کوئی اجنبی اور غیر معروف نام نہیں ہے،لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ابھی تک اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر نہیں آسکا۔ یہاں اس کتاب کے تعلق سے جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا وہ اس کوشش کا ایک حصہ ہے،جس کی مدد سے اس ادبی شاہ کار کو منظر عام پر لانے کی کوشش جاری ہے

اپنے موضوع اور مقصد کے اعتبار سے اخلاق جہانگیری بہت زیادہ دل چسپ اوراہم کتاب ہے۔اخلاق جہانگیری کا تعلق راجستھان سے کئی واسطوں اوررشتوں سے جڑا ہوا ہے،سب سے پہلے آج میں اگراس کتاب پر قلم اٹھانے کے قابل ہوا ہوں تو اس میں سب سے بڑا کردار ٹونک کی علم دوستی کا ہے۔کیوں کہ ہندوستان میں اس وقت کی معلومات کے مطابق اخلاق جہانگیری کا واحد نسخہ جو آج کل نیشنل میوزیم نئی دہلی میں محفوظ ہے وہ ٹونک کی ہی دین ہے۔نیشنل میوزیم میں یہ نسخہ ٹونک کلکشن کا ہی شاہ کار ہے۔اس کے بعد اس نسخہ پر سب سے پہلا تعارفی مضمون اس ادارہ کے روح رواں سابق ڈائریکٹر جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں نے ہی قلم بند کیا تھا یہ تو اس نسخہ سے متعلق بات ہوئی اب اگراس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ راجستھان کی فضیلت اوراہل عرفان کی روحانی وابستگی کا مرکز یعنی اجمیر شریف میں ہی اس کتاب کا آغاز ہوا اوراس کتاب کا مؤلف قاضی نورالین محمد خاقانی برمقام جان افزای دل پذیر اجمیر اس کام کو شروع کرنے کا ارادہ کرتا ہے

حضرت خلافت پناہی از بلدہ آگرہ بجانب مقام جاں افزای دل پذیر حضرت اجمیر کہ مرقد حضرت حقائق پناہ ولایت دست گاہ قطب فلک حقیقیت مرکز دائرہ طریقت والی ملک خواجہ معین الدنیا والدین نوراللہ تعالیٰ مرقدہ نہفت نمودہ چندگاہ ذرا ینجا بنا بر زیارت آستان قدس آشیان توقف فرمودہ

ازآنجاں عنان بکران دولت واقبال وسمنہ حشمت واجلال رابصوب مانڈ ور گجرات منعطف ساقتند شروع درتسوید ایک مقالات محبت آیات نمودہ بود وچوں بامرجلیل القدر فیصل قضایای بلدہ طیبہ لاہور حفظہما اللہ تعالیٰ من الافات والشرور از رفاقت اردومی کیہان پوی مہجور ماندہ۔

بات صرا تنی ہی نہیں بلکہ ایک دل چسپ اتفاق یہ ہے کہ قاضی نورالدین محمد کے والد کا نام بھی معین الدین تھا جو کہ آگے چل کر ایک تحقیقی مسئلہ بن جاتا ہے۔ جب کہ عقیدت مندان شیخ طریقت خواجہ معین الدین اجمیری حضرت غریب نواز سے منسوب ایک دیوان مرتب کرتے ہیں اور انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ اس کی حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں دراصل دیوان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نہیں ہے بلکہ پروفیسر محمود شیرانی اور ان کے ساتھی اور دوست پروفیسر ابراہیم ڈار کی تحقیق اور جستجو کے نتیجہ میں یہ بات منظر عام پر آئی ہے کہ۔۔۔۔اس دیوان کا بیش تر کلام ملا معین فراہی کا کلام ہے۔ تفصیل کے لئے مضامین ڈار میں ایک مفصل مضمون اس تعلق سے موجود ہے رجوع کیا جاسکتا ہے

اس کے علاوہ راقم الحروف نے جب اخلاق جہانگیری کا مطالعہ کیا تو بہت سی غزلیں جس میں نورالدین نے شاعر کا حوالہ نہیں دیا ہے ایسی موجود ہیں جو کہ دیوان معین الدین میں موجود ہیں لیکن چھپے ہوئے دیوان میں موجود غزلوں میں اشعار کی تعداد اور نسخہ اخلاق جہانگیری میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ اخلاق جہانگیری میں مقطع موجود نہیں ہے اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو مقطع محض مقطع کے طور پر غزل کا حصہ ہے اور اس غزل کے دوسرے اشعار کے مقابلہ میں ایک عام مفہوم دیتا ہے۔

اس طرح سے اخلاق جہانگیری کے تحقیقی مطالعہ سے بہت سے حقائق سامنے آنے کی توقع ہے اور جس طرح سے مؤلف نے اسلامی تاریخ کے حوالے جابجا نقل کئے ہیں اور صوفیائے کرام کے اقوال نقل کئے ہیں وہ تنقید، متن میں انتہائی اہم مقام رکھتے ہیں امید کی جاسکتی ہے کہ اخلاق جہانگیری کا تنقیدی متن ہمارے فارسی ادب ماخذ کے سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا

☆☆☆☆☆